رفاہ عام پریس لاہور میں میاں نور الحق کے اہتمام سے شائع کیا گیا

قیمت فی جلد دو روپیہ ۸؍

اُن کرم ہائے بے پایاں کے شکریہ میں جنکا سلسلۂ آلامِ روزگار نے منقطع کر دیا ہے۔ مگر جن کی یاد زمانے کی بے اعتنائیاں ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں۔ مؤلف یہ اوراق اپنے محسن اور مُحبِ صادق خواجہ محمد ابراہیم سلمہ اللہ تعالےٰ بی اے۔ بی ٹی کے نامِ نامی سے معنون کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

افضل علی۔ لاہور
۵۔ مئی

منجانب بارگاہِ دولتِ قلبیہ

بکارِ سرکارِ حُسن

سندِ کارکردگی

یہ سند مسمی قیس عربی النسل حال وارد ہندوستان کو ان خدمات بیش قدر کے صلے میں عطا کی جاتی ہے جو اسنے سرانجام دی ہیں ہم خوش ہیں کہ قیس مذکور نے باوجود مطالعہ کے اہم اور ضروری فرض کے اپنے مستقبل کی قطعی پرواہ نہ کرکے اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو ہماری غلط انداز نگاہوں کے دامن سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیا۔ ہمیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ اسے فرقت کے سخت ترین مصائب اور ہجر کے ناقابل برداشت آلام سے قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں علم ہے کہ ہمارے آغوشِ ناز کے پروردوں نے غیر معمولی استغنا اور لاپرواہی سے کام لے کر بسا اوقات اسے مایوسیوں اور تلخیوں کے حوالہ کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری سرکار کے بد قرار کے فرشتوں نے کئی بار آنکھیں دکھا دکھا کر اسے بے چینیوں کی گردشں میں مبتلا کر دیا۔ مگر ہمیں خوشی ہے کہ باوجود ان تمام دقتوں کے اس کے حسن شناس دل نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ بلکہ عام طور پر ڈھٹائی اور حیرت انگیز دیدہ دلیری سے اپنے قدموں پر جما رہا۔ ہمارے محکمۂ احتساب کے افسرانِ بالا کی رپورٹیں مظہر ہیں کہ

کئی دفعہ جبکہ قیس مذکور کسی دلفریب ہستی کے کوچے کے طواف میں سرگرم تھا ذلت سے نکال دیا گیا۔ مگر اس کے خیر خواہانہ جذبات اور وفادارانہ احساسات نے اسے اجازت نہ دی کہ اس سلوک بد سے بددل ہو کر بغاوت اختیار کرتا۔ محکمہ حسن کے نگرانِ حال بڑے زور سے اس امر کی سفارش کرتے ہیں کہ قیس مذکور نے ہماری سرکار کی عقیدت کیشی میں جو کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ انکا تقاضہ ہے کہ اس کے جذبات کو تحسین و تعریف سے متمیز کیا جاوے وہ اس بات کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہیں۔ کہ ہماری سرکار کا یہ نمک پروردہ اس صیغہ میں جس کام پر بھی ہاتھ ڈالتا ہے اسمیں اپنی تمام قوائے ذہنی و جسمانی کو ہمیشہ ہمیشہ نہایت ثابت قدمی سے صرف کرتا چلا جاتا ہے اور کہ مرورِ ایام سے قیس مذکور کی وحشت خیز آرزؤں میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ سند امتیازی عطا فرماتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اس سند کا حاصل کرنے والا آیندہ بھی اپنی شہرت کو قائم رکھے گا۔ اور ہماری سرکار کی خدمات کی بجا آوری میں زمانۂ ماضی کی طرح سینہ سپر رہیگا +

ہمارے دستخط — بقلم ناز
اور مہر سے جاری — کاتب خصوصی بارگاہِ
ہوا۔ — دولت قلبیہ

سپاس نامہ بحضرت حسن فرمانرواء دولت قلبیہ

عالی جاہا! دربارِ عشق افروز سے جو سندِ کارکردگی اس خادمِ ازلی کو بقلمِ کاتبِ خصوصی دولتِ ابدقرار موصول ہوئی ایسی نہ تھی کہ یہ سرفروشِ قدیمی اس کے جواب میں اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار کئے بغیر رہ جاتا۔ اُس دربارِ بے نیاز کی یہ غیر معمولی نوازش طبیعت میں جسقدر جنون آفرینی بھی کرے کم ہے کیونکہ اب تک تو طبقۂ عشاق کی جانفروشیوں

کا صلہ بجائے خراجِ تحسین کے آبروریزی سے دیا جاتا رہا ہے۔ اور حرمِ محبت میں اس جان نثار کے ہزاروں پیش رو تیغ ابرو کے گھاٹ اتارے جاتے رہے ہیں یہ ہنگام جنوں میں پہلا سابقہ ہے کہ اگرچہ بطریق استہزا ہی سہی۔ لیکن پھر بھی صدر اعلے سے اعترافِ وفا ہوا ہے۔ سوچتا ہوں کہ بارالٰہا ہماری بے اثر دلسوزی میں ایسی حدت کہاں سے پیدا ہوگئی کہ اس کاخِ بلند تک ہماری تپشِ اندرونی کے شرارے جا پہنچے۔ مقام شکر ہے کہ زمانے نے پلٹا کھایا اور ہماری بے نوا جماعت بھی بنظر اعتماد دیکھی جانے لگی۔ لیکن شاہا اگر اس اعتراف کریمانہ کیساتھ درِ مراعات بھی اس خاک نشین پر وا کر دیا جاوے۔ تو پرورش خاص ہوگی اگرچہ امید ہے کہ یہ سند ہر ایک مقام محمود پر پروانہ راہداری کا کام دیگی لیکن اگر حضور اپنے صدرِ مقام سے ایک گشتی توقیع تادیبی بھی جاری فرمادیں تو اس بارگاہِ رفعت نشاں کے زودکار نونہال اپنی جبلی ستم ظریفی میں مداومت سے باز رہیں گے۔ اور ہم آفت کے ماروں کے ساتھ سلوک تلطف روا رکھیں گے۔

مگر حضور والا آجکل تو کلیۂ پنجاب نے درس گاہوں کا انداز ہی بدل دیا ہے کجا وہ مکاتب ماضی کہ جن کی تعریف سنکر مولانا غنیمت جیسے حوصلہ مند لوگ "تکلف بطرف از خویش رفتم" کہتے ہوئے سکون قلب بہم پہنچانے غذرِ دلفروشی کرتے جا پہنچتے تھے اور بہزار دلنوازی کامیاب بحصولِ مدعا لوٹتے تھے ؎

شنیدم دوش از طرز آشنائے | کہ از مکتب نکوتر نیست جائے
خصوصاً مکتبِ عشق آفرینے | مقام ہمچو شاہد ناز بینے
برآمد بردرے مکتب خروشم | کہ من جنسی پارۂ دل میفروشم
بگفتا بیشتر آ پیش رفتم | تکلف برطرف از خویش رفتم
بگفتا "قیمتش" گفتم نگاہے | بگفتا کمترک گفتم کہ "گاہے"

عشق آفرین تو بیشک آج کل کے کالج بھی ہیں اور شاید مقام شاہی بھی ہیں ہو لیکن نصابِ تعلیم کچھ ایسا ثقیل کر دیا گیا ہے کہ سیپارۂ دل کے سودے کی طرف کسی خانہ سوز کو توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر بقدر لطافتِ حسن ہو بھی تو مذاق خریدا ایسا بدل گیا ہے کہ اس جنسِ لطیف کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ؛

عالیجاہا۔ مغربیت دلوں پر ایسی حاوی ہو گئی ہے کہ الفت و موانست دنیا سے یکسر اٹھ گئی ہے۔ آہ اگلے لوگ کیسے خوش اخلاق تھے۔ اگر جیتے تھے تو احباب کے لئے اور مرتے تھے تو سوزِ محبت میں جلکر۔ آجکل رسم دوستداری تو دنیا میں نظر ہی نہیں آتی۔ اصولِ زندگی بدل گئے ہیں۔ پیکارِ حیات اسقدر سخت ہو گئی ہے کہ ہر ایک اپنے مفاد کی نگرانی اور افزائش ہی کو زیست کا نصب العین قرار دیئے ہوئے ہے حب الوطنی کی آڑ میں نام نہاد خادمانِ قوم بمدارج شہرت و وقار کے زینے پر چڑھنا چاہتے ہیں۔ اسے ہم دلجلوں کا انتقام سمجھو یا مصلحت ایزدی کہ انکی سادہ لوح قوم انہیں ابلہ فریبی کی جرأت دلائے جاتی ہے تا اینکہ وہ حصول خواہشات کی سیڑھی کے آخری درجہ پر پہنچ لیتے ہیں۔ اور پھر وہی قوم ربا لقلب ربانی کہو سیڑھی کھینچ لیتی ہے اور ہماری طرز زندگی کے مخالف ہماری آرزوؤں کے دشمن ہماری حصولِ تمنا میں سدِ راہ۔ دولت قلبیہ سے منحرف۔ بیک جنبشِ چشم بیمارِ قوم اوندھے منہ ملاء اعلےٰ سے ہم خاک نشینوں کے درمیان آگرتے ہیں ؛

حضور والا۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں رشتۂ الفت سمجھا جاتا [illegible] کر فقط خاوند بیوی کے تعلقات کو مضبوط کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ یورپ والوں کا مذاق انتخابی ممکن ہے اس قانونِ عقد سے پرورش پاتا ہو لیکن یہاں تو بیویاں لاٹری میں ملتی ہیں اگر نصیب یاور ہوا تو مذاق یکساں نکلے ورنہ تمام عمر یہ خلیج حائل رہتی ہے [illegible] دونوں میں سے ایک پر موت وارد ہو اور دوسرا [illegible] فیصلہ [illegible]

اس پر غضب یہ کہ چودھویں صدی کی لیلےٰ بقول حضرت لسان العصر آوارۂ جنون قیس کے عقد میں نہیں آسکتی۔ جب تک کہ مغربی اصول کی یونیورسٹیاں اسے ایم اے کی سند نہ بخشیں۔ بیچارہ قیس تمام لطیف جذبات کو مار کر اس سندِ امتیازی کے حصول میں کوشاں ہوتا ہے تو اس کو اور صدہا امور مانع ہوتے ہیں۔ ارباب محنت کے زمرے میں شامل ہو کر دماغی مجاہدے میں کامیاب ہونا اس شخص کے لئے جس کا دماغ وقفِ خیالِ لیلےٰ ہو چکا ہو کسقدر دشوار ہے۔ ہر وقت وصالِ موہوم کا نا منقطع ہونے والا سلسلہ ذہن میں نقشِ دوام کی طرح جما رہتا ہے۔ اس پر پروفیسر صاحبان کا تشدد کہ ریاضی۔ تاریخ۔ یا علم حیوانات کے ادق مسائل سمجھنے کے لئے ذہن تمام خارجی اثرات سے فارغ ہونا چاہئے قیس اگرچہ فرماں بردار شاگرد کی طرح پروفیسر کے احکام کی تعمیل کا اقرار صمیم قلب سے کرتا رہتا ہے لیکن آہ وہ ہمیشہ کی طرح تڑپنے والا دل اور وہ قلب مضمحل (جو سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل کی توضیح کے وقت بھی علی الرغم پروفیسر اپنی حالت اضطرار سے باز نہیں رہ سکتا) ہر ایسی بحث سے جو اُسے لیلےٰ کے خیال سے ہٹا دینے والی ہو۔ غور و غوض کرنے سے قاصر رکھتا ہے لیکن مشکل تو یہ آپڑی کہ قیس کی آیندہ ساس نے جو شرطِ وصلِ لیلےٰ ایم اے پاس کرنے میں لگا رکھی ہے اس کا پورا کرنا بھی قیس کا اخلاقی فرض ہو چکا ہے *

سرکار۔ وکیل ہے ہم ایم۔ اے والوں کی حالت پر میری سنئے کہ گھر سے دور۔ خویش و اقارب سے جدا۔ لیلےٰ خیالی سے مفارقتِ صوری کے عالم میں۔ ایک مختصر سے تین گز لمبے ڈھائی گز چوڑے بورڈنگ ہوس کے کمرے میں پڑا کتب درسی سے کشتی لڑ رہا ہوں۔ اگرچہ یارانِ نجد کے خیال میں میں لاہور کی ڈھائی لاکھ آبادی میں سامان تفریح حسبِ مذاق افراط سے بہم پہنچا سکتا ہوں لیکن حضور اس بندۂ مشقت سے ہی پوچھیں کیا بیچارگی کی کیفیت ہے *

حضور کے رحم کو جوش میں لانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اصل حقیقت بے خبر پبلک اور ستم ظریف ..... ل ..... (ہاں کبھی کبھی اخفا بھی ہونا چاہیئے) تک پہنچانے کی غرض سے عرض پرداز ہوں کہ ایک بار اپنے معزز کاتب خصوصی کو دورہ پر اس کالج کی حالت ملاحظہ کرنے کے لئے بھیجدیں خصوصاً میرا کلبۂ احزن جو کہ شعاع حُسن کا محتاج۔ میری تیرہ بختی سے ہر وقت متاثر۔ عالم دوزخ کی تاریکی میں رہتا ہے۔ اس رفعت نشان دربار اور دولتِ قلبیہ کے محترم دبیر کی آمد سے ضرور کسب انور کریگا۔ اس لاہور کی بالا از شمار جاندار آبادی کے گوشۂ جنوبی میں بندۂ درگاہ ایک تنگ سے کمرے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ سامنے دروازے پر چک آویزاں ہے۔ پیش نظر چھوٹی سی دُنیا کا تماشہ ہے۔ میرے سامنے سے تمام نو وارد۔ آئین وفا سے ناآشنا فسٹ ایئر و سیکنڈ ائیر کے طلبا تھرڈ ائیر و فورتھ ائیر کی مربیانہ توجہ کے سائے میں شرم آگیں تبسم زیر لب کے ساتھ یا بے حجابانہ لوچ دار قہقہے لگاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ انہیں سے بعض کی خوشی کا مدار ساعت قریبہ کے لطافت سوز اور دائمی خشم آلود پروفیسر کی ایک خلاف معمول نگاہ تلطف پر ہے بعض اپنی شبِ گذشتہ کے رٹے ہوئے فقروں کی چست بندش پر نازاں مجلس ادبی کی رونق بڑھانے کے خیال میں سر بلند و گردن کشاں چلے جاتے ہیں لیکن بعض حیا پرور مبتدیانِ کالج جنہوں نے اپنے سینئر طلباء کے زیر اثر اپنی شخصیت کو بالکل معدوم کردیا ہے کمال بے بسی کے انداز میں چند ایک گرگ باراں دیدہ از کالج کی کشتی کے ملاح جن کی عمر کا اندازہ کسی قدر مبالغے .. کے ساتھ تیس ۳۰ اور پنتیس ۳۵ سال کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اور جنہیں اس کالج میں دس بارہ سال کے قیام کے باعث ہر ایک خوب جانتا ہے۔ اور جاننے کے ساتھ انکی عاقبت سوز طرز زندگی کی بے باکی سے خوف زدہ بھی ہے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے میری چک کو اپنی

پوشاک فاخرہ سے رگڑ کر ایک صدائے پرترنم پیدا کرتے ہوئے بجلی کی طرح نکلجاتے ہیں۔ اے راز ہستی کے اندوہناک کیفیتوں سے بے خبر انسانوں خدا کے لئے ایک دفعہ تو چک اُٹھا کر دیکھو کہ اس شکستہ پردے کی تیلیوں کے پیچھے۔ نوعی کیفیات میں بالکل تمہاری طرح لیکن جذبات فطری میں تمہارا مخالف کس بے مزہ بلکہ بدمزہ زندگی کی تلخکامیوں کا شکار حالت مذبوحی میں پڑا کراہ رہا ہے۔ آہ تم تو موجود اوقت آسائیشوں میں مخمور دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر عشرتِ دوام کے مزے لوٹ رہے ہو۔ لیکن تمہارا ہی ایک ہم جنس مرقد نما کمرے میں حیات میں موت کا مزہ چکھ رہا ہے بی۔ اے تک وہ بھی فراغت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ کس امید پر؟ اسی لئے نا کہ بی۔ اے کر کے اس کی پُر اضطرار حالت میں ایک سکون آجائے گا۔ کیونکہ اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ کہ ہموار رشتہ میسر آنے کی یہی شرط ہے +

لیکن آہ ہوس ناک تقلید مغرب کا برا ہو لیلےٰ کے وارث اس پر مطمئن نہیں ہوئے اور سخت تر آزمائش یعنی ایم۔ اے کی تکمیل کا ڈھکوسلا کھڑا کر دیا۔ ابتو مجھے بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید لیلےٰ میری قسمت ہی میں نہیں۔ اُف! اس کے اقربا محض طعن خلق سے محفوظ رہنے کے لئے لاطائل عذر یکے بعد دیگرے کھڑے کر دیتے ہیں۔ آہ میرا پیش رو بھی تو اسی طرح بادیہ پیمائی میں عمر گنوا کر واصلِ حق ہؤا تھا۔ معلوم ہوتا ہے میری دماغی محنت بھی کسی دن مجھے مار کر رہیگی۔ کیونکہ جب پیوستہ تنہائی میں لیلےٰ کی یاد بہت تنگ کرتی ہے۔ تو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ ہاں کسی روز یہ قلب مضطرب بھی مہلک دورے کی تاب نہ لا کر آپ سے آپ بند ہو جائیگا +

عالیجاہا۔ بہت طول کلام ہو گیا۔ ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ حکایت بھی کہاں تعلیم یافتہ مجذوب کی بے ربط۔ بڑ۔ قلم تو اٹھایا تھا اظہار تشکر کیلئے

اور چھیڑ دی یہ داستان غم۔ لیکن اس میں بھی ایک راز ہے وہ یہ کہ شاید حضور کی بارگاہ تک یہ صدائے احتجاج پہنچکر منشور سلطانی کے اجرا کا باعث ہو جس کی تکمیل وارثان لیلٰے پر لازم ہو جاوے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ مجھ سے ایم۔اے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ جو مصیبت ایک دفعہ قبول کر لی۔ وہ تو انشاء اللہ طے ہو ہی جائے گی۔ مرتا کیا نا کرتا البتہ یہ ضرور گذارش ہے کہ ایم۔اے کی تکمیل کے بعد حسب عادت یہ نہ ارشاد ہو۔ کہ ولایت جاکر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرو تو لیلٰے سے عقد ہو سکتا ہے۔ ناصاحب اب دماغ اس قابل نہیں کہ اسپر مزید زور ڈالا جائے ؎

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلٰے ۔۔۔ تو استعفا مرا با حسرت و یاس

حضور والا سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوا مختصر نامہ بند کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں (اگرچہ مجھ سے پہلے قیس کی دعائیں کب منظور ہوئیں تھیں) کہ جب تک دنیا میں سلسلۂ تعلقات بین القلوب جاری ہے آپ کی حکومت جملہ نوع بشری پر اور خصوصاً ہر آنے والے قیس پر دائم و قائم رہے اور نمک پروردگان پر چشم ترحم۔

؎ فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کیلئے

بقلم نیاز دعا گوئے دولت ابد قرار

خاکسار قیس متعلم ایم اے کلاس

پیامِ قیس

پھر ہوئی لیلیٰ مجنوں کی حکایت تازہ

ان کا عالم ہے وہی قیس کا نقشہ ہے وہی*

بہار کا موسم صبح کا وقت ہے۔ آفتاب اپنی پوری تمازت کے ساتھ ابھی تک نمودار نہیں ہوا اور اگر ہو بھی تو آج ابر آلود فضا میں اس کی تیز اور خیرہ کُن شعاعوں کا چھن کر ہم خاک نشینوں تک پہنچنا ہی کب ممکن ہے۔ ایسا دن طالب علم کی دماغی جد و جہد کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہُوا کرتا ہے۔ ہندی شاعری کی بے ربط خیال آرائیوں میں ایک موزوں سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فلسفی کی خشک اور بے نمک استدلال میں بھی رنگ شعریت ٹپکنے لگتا ہے۔ ضرور ہے کہ لیلیٰ کی گفتگو بھی (جو یوں تو ہمیشہ ہی سازِ زندگی کے لئے نوائے جان آفریں ہُوا کرتی ہے) آج سماعِ قیس کے لئے کمالِ موسیقی کا اثر رکھنے والی ہوگی۔ یہ لطفِ قدرت جہاں ہر چیز میں حُسنِ خواص کی نمو کا موجب ہے چاہئے تھا کہ قیس کو بھی اوجِ تخیل پر پہنچا دیتا۔ لیکن یہاں تو نزاکتِ حسّی پر غیر معمولی جنون مستزاد ہوتا نظر آتا ہے۔ شب و روز کا پیوستہ جوش آج ولولہ بن کر قلم سے نکلنا چاہتا ہے۔ جنونِ جسارت خیز کا تقاضا ہے کہ بلا توسّلِ غیر سے لیلیٰ کو اپنی حالتِ بیچارگی سے آگاہ کیا جاوے۔ اے خدا تو ہی اپنے مجنوں کو ایسا اندازِ بیان عطا فرما کہ لیلیٰ مسحورِ التجا ہو کر اس کے مفہومِ قلبی کو سمجھنے پر قادر ہو سکے اور ہمیشہ کی طرح اپنے مردم ناشناس وارثوں کے لگائے بجھائے سے برافروختہ ہو جائے۔

---

*حضرتِ نیرنگ معاف فرمائیں گے۔

"متاعِ حیات لیلیٰ! تمہیں یاد ہوگا کہ سال گذشتہ میں جب اللہ تعالیٰ نے مجھے امتحان بی۔اے میں کامیاب فرما کر تمہارے والد بزرگوار سے سرخرو کیا تھا تو میں نے بصد منت تمہارے اور اپنے محترم بزرگ کی خدمتِ گرامی میں ایک درخواست گذرانی تھی جس کا جواب محاربات فرنگ کے ایک دور دراز نامعلوم مقام سے میرے قصورِ امید پر بمب کی طرح گرا تھا۔ میری تمام دلفریب آرزوں کے ہوائی محلات کے اس آتش پوش پیغام نے پرخچے اڑا دیئے تھے کیونکہ اس میں رقم تھا کہ سرکارِ ابد قرار کا حقِ نمک ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اختتامِ جنگ تک اپنی جان ہتھیلی پر رکھے غنیم روسیاہ کے مقابلے پر اڑے رہیں اور آثارِ جدال و قتال سے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب فتح و نصرت کا نوشتہ دیرِ بارگاہِ رب العزت سے ہمارے شہنشاہ جمجاہ کے نام صادر ہونے والا ہے۔ پس تم عقل و ہوش کو قائم رکھ کر فرمانبردار بچے کی طرح پھر کالج میں داخل ہو جاؤ۔ اور ہماری مراجعت تک ایم۔اے کی انتہائی ڈگری بھی حاصل کر لو تو انشاء اللہ ہم تمہیں اپنے خاندان سے اتحاد دائمی کا موقع دیں گے۔ ہاں اس عرصے میں کہ ہم گھر سے دور رہنے پر مجبور ہیں۔ تمہیں اختیار ہے کہ گاہے گاہے خط کے ذریعے ہمارے متعلقین کی خیریت دریافت کر لیا کرو۔"

یہیں تک لکھنے پایا تھا کہ چک اُٹھی۔ میرے اصولی دشمن۔ جذباتِ اُلفت سے ناآشنا مذہبی ہیجان کے تنگ دائرے میں محصور۔ اپنے فرقے کو ناجی اور باقی تمام دنیا کو دوزخ کا ایندھن سمجھنے والے۔ کھانستے کھنکھارتے کمرے میں آداخل ہوئے۔ سلام علیکم کہکر بے تکلف دھم سے کرسی پر گر پڑے۔

قیس ۔ فرمائیے حاجی صاحب آپکی تو قلبِ ماہیت ہی ہو گئی۔ ابھی ایک ماہ ہوا۔ زیارت ہوئی تھی۔ تو یہ نورانی چہرہ اس خس و خاشاک سے پاک تھا۔

حاجی جوشف۔ خدا سے ڈرو۔ شریعت میں ٹھٹھا کرتے ہو چند روز ہوئے ہمارے گاؤں میں ایک نابالغ لڑکی کو پادریوں نے عیسائی کر لیا۔ وارثوں نے دعوے کیا ہے معلوم نہیں کیا فیصلہ ہو اس واقعہ سے ایسا متاثر ہؤا ہوں کہ عملاً اور شکلاً مسلمان بننے کا تہیہ کر لیا ہے ؛

قیس۔ جزاک اللہ شکلاً تو ماشاء اللہ مجاہدین کے زمرے میں شامل ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اعمال میں بھی تبدیلی ہوئی ؟

حاجی جوشف۔ بس آپ نوک جھونک سے باز نہیں آتے۔ ارے میاں دن بھر دکان میں جان کھپاتا ہوں نماز باجماعت ہو نہیں سکتی۔ اکیلے پڑھنے میں وہ لذت کہاں۔ دیکھو آہستہ آہستہ پابند ہو جاؤں گا۔ چلو آج اہل حدیث اور شیعوں کا مسئلہ خلافت پر بڑے معرکے کا مباحثہ ہوگا۔ قبلہ مولوی صاحب ہماری طرف سے بولینگے۔

قیس۔ میں تو مباحثے کا اصولاً مخالف ہوں آجتک کبھی کسی فیصلے پر تو پہنچے نہیں البتہ علمائے اُمت بازاری لوگوں کی طرح تُو تُو میں میں کر کے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور مسئلہ خلافت تو ایسا پیش پا افتادہ جھگڑا ہے کہ اس میں وقت صرف کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ خلفاء انبیا کی طرح مامور من اللہ تو ہوتے ہی نہیں محض نوزائیدہ مذہب کی شیرازہ بندی اور انتظام سلسلہ قائم رکھنے کے لئے شوریٰ سے نصب خلافت ہوتا رہا ہے۔ تیرہ سو سال بعد آنے والی نسلوں پر زمانۂ ماضی کے امراء ملت کا اقرار یا انکار کیا اثر ڈال سکتا ہے ؛

حاجی جوشف۔ کالج کی تعلیم نے آپ کو اسلام سے قطعی بے بہرہ کر دیا ہے لو جی اگر آج ہم اپنے مشاہیر کی حرمت پر جانیں نہ لڑا دیں۔ تو فردائے قیامت میں مالک یوم الآخرت کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اچھا اگر آپ نہیں چلتے تو بندے کا سلام ہے"

قیس۔ بسم اللہ۔ لیکن خدا کے لئے اپنے دائرۂ اخلاق کو ذرا وسیع فرما دیں مبلغ

اسلام آپس کی جوت پیزار پر ہی صرف نہیں ہونا چاہیئے۔ فروعات سے بلند ہو کر اصول کو مضبوط پکڑیں ؎

ہاں میں کیا لکھ رہا تھا اُف میرے تمام خیالات پراگندہ کر دیئے۔ خدا سمجھے ان خدائی فوجداروں سے۔ آئے تھے کہیں سے الٰہی اجارہ دار بن کر ؎

"پس بموجبِ حکم کالج میں داخل ہو گیا ہوں لیکن اب زمانہ کے مصائب اور دائمی وحشت خیالی نے دماغ کو کام سے معطل کر دیا ہے۔ عرصے سے خیال کر رہا تھا کہ تمہیں اپنے حالات سنا کر اپنے درد میں شریک کروں۔ لیکن قلم اُٹھاتے ہوئے ہاتھ لرزتے تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ خط لکھ کر میں تو جواب کا منتظر ہو جاؤں گا۔ اور تمہارا امید سوز تغافل ہر ایسی توجہ سے جو اس ناکام محبت کے لئے حیات بخش ہو تمہیں باز رکھے گا لیکن آج افکا کی فراوانی نے مجبور کر دیا ہے۔ یہ تمہارے رحم پر چھوڑتا ہوں۔ جواب دو یا نہ دو ؎

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

اگر گذشتہ مخزن تمہاری نگاہ سے گذرا ہو تو سمجھ لو کہ اس عزلت نصیب کا تمہارے فراق میں کیا حال ہے۔ میرا کلبۂ احزن یوں تو ہمیشہ ہی اندھیرے میں چھپا رہتا ہے لیکن آج ابر کے باعث بالکل تاریک ہو رہا ہے لیمپ کی روشنی میں خط لکھ رہا ہوں۔ میرے ہم مشرب کمروں سے باہر نکلے۔ ٹھنڈی ہوائیں سامانِ تفریح بہم پہنچا رہے ہیں اور میرے کمرے میں دن کے وقت لیمپ جلتا دیکھ کر قہقہہ لگاتے گذر جاتے ہیں۔ آہ تمہارے فراق نے کیسی جگ ہنسائی کروائی ہے پھر بھی تمہارا دل نہیں پسیجتا۔

خدا کو مانو روز میرے لئے نئی آزمائش کیوں کھڑی کی جاتی ہے کیا مجھ جیسے سودائی صحرا نورد کو شہر بند کر دینا قیدِ زندان سے کم تھا جو ساتھ تحصیلِ علم سے اسے بامشقت بھی کر دیا۔ عام دستور ہے کہ جو قیدی زمانۂ گرفتاری میں شرافت کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ تو انہیں میعاد ختم ہونے سے چند روز پہلے داروغۂ زندان کی سفارش پر رہا کر دیا جاتا ہے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ تمہارا گنہگار محبت اپنی مقررہ قیدِ بامشقت کو ہنسی خوشی محض تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کی امید پر گذار دیتا ہے تو دو سال حبسِ مزید کا حکم صادر ہوتا ہے اور مقدارِ مشقت میں بھی ہلاکت خیز اضافہ کر دیا جاتا ہے آہ۔ سوچو تو سہی جو بیمار پہلے ہی اس مشقت کی تاب نہ لا کر محض پوست و استخوان رہ گیا ہو۔ وہ ایم اے کی تکمیل تک کیونکر جانبر ہو گا ؎

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

تمہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے انبوہِ خلائق سے کس قدر تنفر ہے پھر جان بوجھ کر مجھے لاہور جیسے گنجان شہر میں دھکیل دینا کیا مروت تھی۔ صبح سے شام تک میرے گوشۂ تاریک میں آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ آہ دنیا کس قدر نمائشِ احسان کی خوگر ہے۔ یہ لوگ میرے پاس آکر طرح طرح کے سوالات سے تنگ کر ڈالتے ہیں۔ جبراً و قہراً منافقانہ خندۂ زیرِ لب کیساتھ جھوٹی سچی پُر تصنع گفتگو سے ان کی تواضع کرنے پر مجبور ہوتا ہوں اس پر لُطف یہ کہ وہ میرا وقت ضائع کرنے پر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ قیس کو ہمارا مشکور ہونا چاہئے ہم دور سے چلکر اسکا دل بہلانے آتے ہیں "

ایلو ایک اور آفت آئی۔ سامنے سے ایک اچھا خاصہ موٹا تازہ انسانی پیکر ہیں

چھوٹا سا ہاتھی جھومتا جھومتا میرے کمرے کی طرف دندناتا آ رہا ہے بس اب میں خط کب لکھ سکتا ہوں۔ وہیں سے چنگھاڑنا شروع کر دیا۔

قیس۔ آیئے چغتائی صاحب آج خلافِ معمول صبح کا مطالعہ چھوڑ کر کیسے نازل ہوئے۔

چغتائی۔ یار چلو آج بڑا مزیدار میچ ہے۔ موت اور زندگی کا سوال ہے۔ دل میں ٹھانی ہے اگر لڑائی ہو پڑی تو گراؤنڈ پر ہی دو چار حریف کھلاڑیوں کو کچل ڈالونگا۔

قیس۔ مجھے معاف نہیں فرماتے۔ ایک آرٹیکل سوسائیٹی میں پڑھنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آج ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔

چغتائی۔ جانے بھی دو۔ اپنا وقت ہرج کر کے محض تمہارے لئے دو میل سے چل کر آیا ہوں۔ یار پاگل تو نہیں ہو گئے۔ یہ وقت کمرے میں بیٹھنے کا ہے تمہاری کالج سپرٹ بھی مر چکی ہے۔ چلو چل کر ذرا غل مچائیں۔ اپنے کھلاڑیوں کے دل بڑھائیں۔ دشمنوں پر آوازے کسیں پھبتیاں اڑائیں۔ ابھی تو امتحان میں ایک سال پڑا ہے کالج میں آکر کتاب کا کیڑا بننا ہی مقصد نہیں ہوتا صحت کا بھی خیال چاہیئے۔

قیس۔ نہ بھائی تم جاؤ اور خاموشی سے میچ دیکھو تمہارے بغیر بولے ہی شکل و صورت سے ہیبت طاری ہو جاوے گی۔ فسٹ ائیر سیکنڈ ائیر کے لئے تو تم اچھے خاصے ملک الموت ہو تمہاری شکل دیکھتے ہی سہم جاتے ہیں اور جو منہ سے بھی بولو گے تو بس معصوم جانوں کا دم ہی نکل جائے گا۔

چغتائی۔ اچھا پھر یہ میری آخری ملاقات سمجھو۔ اب میں تمہارے پاس نہ آؤں گا۔

قیس۔ خدا کے لئے کہیں ایسا غضب نہ کرنا میرے پُر ملال یکساں سکون میں تم ہی تو ذرا طوفان مچا جاتے ہو۔ (قیس لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے لیکن غم و غصہ کے باعث کچھ نہیں لکھ سکتا۔ پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے قلم فرش پر پھینک کر کمرے

میں ٹہلنے لگتا ہے۔ چند منٹ کے بعد پھر لکھنا شروع کرتا ہے)

سمایۂ زیست لیلیٰ! میں کیا لکھ رہا تھا۔ اُف بالکل ذہن سے اُتر گیا۔

ہاں۔ اُڑتی ہوئی خبر سُنی ہے کہ تمہارے والد بزرگوار کی تو مرضی نہ تھی کہ

میری قید بامشقت میں دو سال کا اضافہ کیا جائے تم نے خود اُنہیں اس

مطالبہ پر آمادہ کیا ہے آہ۔ میری جاں فشانیوں کا عوض ایسی ہی جفاپرری

ہونا چاہئے۔ سوچو تو سہی تمہارے درمیان ایک مسافر اپنے دوستوں

خویش و اقارب کو چھوڑ کر محض نگاہِ کرم کے سہارے آن پڑا ہے کیا تمہارے

وارث سزا تجویز کرنے میں کم سختی کرتے ہیں جو تم اپنی مشورت سے انہیں ......"

رقیس فقرہ ختم نہ کر چکا تھا کہ ارضی نکیرین اس کے مرقد نما کنج عزلت پر اپنا فرض

منصبی پورا کرنے یعنی احتساب اعمال کے لئے تعینات ہو گئے)

پہلی آواز۔ کیوں جی میاں مجنوں سودا میں کچھ کمی ہوئی یا ابھی وہی عالم ہے +

قیس۔ (چشم پُر آب ہو کر) آہ ظریف بہت جلد میں تمہارے درمیان سے رخصت

ہونے والا ہوں مجھ سے [illegible]لوں کے آئے دن کے مطالبات پورے نہیں ہو سکتے۔

آہ کو چاہئے اِک عمر اثر ہوتے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

ظریف۔ بس تمہیں ہمیشہ روتے ہی سُنا۔ مُ[illegible]لبہ بھی کیا ہے معیار زیست تنگ

ہو رہا ہے مقابلہ سخت ہے۔ ایم اے کر لوگے آرام کے دن بسر کرو گے۔ عورتوں کی

طرح واویلا کیوں کرتے ہو۔ یار آج راستے میں بڑا مزا ہوا۔ ایک اودھ کے لالہ صاحب

میرے ہمسفر تھے۔ ہم آسنے کی پوریاں لا کر رکھیں پانی لینے گئے میں نے بھی ہم آنے

دیئے کہ میرے لئے بھی لیتے آویں۔ گاڑی چل پڑی۔ لالہ جی پانی کی گڑوی بھر کر ریل

میں سوار ہو گئے میرے رنج و غصہ کی انتہا نہ تھی میں نے ان کی پوریاں ہضم کر لیں

شروع کر دیں۔ اب لالہ صاحب ہکا بکا دیکھ رہے ہیں آخر بھرائی ہوئی آواز میں بولے "آپ بڑے بے تمیز اُجڈ ہیں کہیں کے" میں نے عرض کی کہیں کا تو نہیں پنجاب کا ہوں "نہیں اور طیش آیا۔ کیونکہ پوریاں ختم ہو رہی تھیں کہنے لگے "بس بس تم نہایت بیہودہ ہو" عرض کی "نہایت تو نہیں البتہ قدرے بیہودہ ضرور ہوں" اس پر جھنجلا کر کہا "تو تو اُلو کا پٹھہ معلوم ہوتا ہے" میں نے آنکھیں لال کر کے۔ نتھنے پھیلا کر۔ تیور چڑھا کر گلے کی رگیں پھلا کر اور شکستہ بازو کا ٹنڈ انکے سامنے کر کے کرخت آواز میں کہا "اندھے ہو دیکھتے نہیں میرے تو انسانی رگ و پٹھے ہیں چاہو تو دو دو ہاتھ کر کے آزمالو" تمام گاڑی کے مسافر ہنس پڑے۔ لالہ جی اور زیادہ جھلائے میں اتنے میں پوریاں ختم کر چکا تھا پھر کہا "لالہ پانی پلا دو" لالہ جی۔ پھر پیچھے ہٹے میں نے جلدی سے گڑوی تھام لی اور اپنے گلاس میں پانی اُنڈیل کر پی لیا۔ اب تو لالہ جی آپے سے باہر ہو گئے پیسے میری طرف پھینک دیئے اور اپنا منہ پیٹ لیا اور اپنے تئیں گالیاں دینے لگے میں نے پیسے تو جیب میں ڈالے اور ذرا بگڑ کر کہا "بدزبانی کیوں کرتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ آرام سے بیٹھو نہیں تو ابھی کھڑکی میں سے نیچے پھینک دوں گا" تب لالہ جی ٹھنڈے ہوئے۔

قیس۔ تم بڑے شہ پر ہنسوڑ واقع ہوئے ہو۔ اسی طرح مشق شرارت میں تم نے اپنا ہاتھ بارود سے ضائع کر دیا۔ کسی دن کوئی دل جلا مار ہی ڈالے گا۔

مظہر الاسلام۔ ان کی چلبلاہٹ ہی تو ان کی موت کا باعث ہوگی۔ خیر سنو ہم آج ایک خاص نیکی کے ارادے سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ دیکھو تم دنیا میں بالکل اکیلے ہو صحرا نورد تمہارا لقب ہے دنیا میں اکیلا خدا دشمن کو بھی نہ کرے۔ تمہاری ہر وقت کی تنہائی تمہیں زیادہ مجنوں بنا رہی ہے۔ آؤ ہمارے سلسلے میں داخل ہو جاؤ آخر ایک دن مرنا ہے۔ رب یوم الحساب کی بارگاہ میں تحفۂ نیاز پیش کرنا ہوگا۔

بہتر یہی ہے۔ کہ میرے مرشد کی بیعت کر لو۔ تمہیں ایک بڑی محکم برادری بھی میسر آجائے گی۔ جو ہر حال میں بھائیوں کی طرح تمہارے دُکھ درد میں شریک ہو گی۔ توشۂ آخرت بھی مہیا کر لو گے۔

قیس۔ اجی جب آبائی فرقے کی بندھن سے رہائی پائی تو پھر ایک تنگ تر حلقے میں کس طرح پھنس سکتا ہوں ؎

جب بیکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنو حضرت میں اسلام کو ہمہ گیر مذہب سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ اس کے دائرے کو نقطہ سے زیادہ وسعت نہیں دے سکتے۔ اگر اپنا توشہ قلیل ہوگا۔ تو آپ جیسے ارباب جنت کی دریوزہ گری کر لیں گے۔ نہیں تو پیوستہ روزے رکھ کر دن گذاریں گے؟

ظریف۔ بھلا! یہاں تو روزہ کے نام سے غش آنے لگتا ہے وہاں مسلسل روزے کیونکر نبھیں گے۔ دیکھو کسی سلسلے سے ضرور اپنے آپ کو وابستہ رکھنا چاہیئے۔ عقیدہ خواہ کچھ ہو لیکن تھوڑی سی منافقت حیاتِ انسانی کے لئے ضروری ہے مجھے دیکھو کہ صوم وصلواۃ کی پابندی اور دیگر حکمائے پیشیں کی اختراع کردہ مذہبی قیود سے بالکل آزاد ہوں لیکن دُنیا میں بھرم رکھنے کو اس سلسلۂ عالیہ سے بڑا مضبوط تعلق رکھتا ہوں والا آج کل کے واعظین کی تلقین تو میرے پتھر دل پر قطعی اثر نہیں کر سکتی۔ غضب ہے یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں بھی حضورِ قلب سے نہیں جاتے پچھلے رمضان میں تراویحاں ہو رہی تھیں میں پچھلی صف میں کھڑا تھا۔ لوگ ظاہر بڑے خضوع وخشوع سے نیت باندھے کھڑے تھے مجھے جو شرارت سوجھی میں نے نیت توڑ دی اور اچانک چلا اُٹھا سانپ! سانپ!! سانپ!!! بس پھر تو تمام نمازی صحنِ مسجد میں حواس باختہ کودتے پھرتے تھے۔ کئی ایک تو دیوار پھاند کر مسجد سے

باہر جا پڑے سارا تقوے دھرے کا دھرا رہ گیا دوسرے روز میں جناب امام کے پیچھے کھڑا تھا جب حضرت سجود میں گئے میں نے چپکے سے دندانہ دار تیز کلپ نکال کر حضور کے ٹخنے کے پاس چمٹا دی ایک چیخ مار کر امام پچھلی سے پچھلی صف میں جا گرے اور لگے فریاد کرنے "مار ڈالا رے اُف سانپ نے ڈس لیا ہائے میاں میں مرا ہائی ہے۔ مجھے گھر پہنچاؤ" اب سب نمازی حیران ہیں کہ کہاں کاٹا کسی کی ٹخنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ آخر امام کو کاندھے پر لاد گھر لے گئے اور نمازی سانپ کی دہشت سے اپنے گھروں میں جا چھپے۔

مظہر الاسلام۔ استغفر اللہ۔ تمہیں لوگوں نے وہیں کیوں نہ مارا۔

ظریف۔ اجی کسی کو اپنے سر پیر کی تو ہوش نہ تھی۔ میں مسجد سے نکل کر گھر آ رہا تھا راستے میں داؤد ملا کمبخت ہمیشہ آدھی رات کے وقت گھر آتا ہے سوتوں کو بیزار کرتا ہے میں نے کہا ذرا اسے ڈراؤ۔ پاس ہی ایک عمارت بن رہی تھی وہاں سے بیلچہ لیا ٹوکری سر پر رکھی کمبل اوڑھ ڈراؤنی شکل بنا اس مقام پر آیا۔ داؤد تو نکل گیا تھا۔ لیکن قبلہ دادا جان سو برس کی عمر لاٹھی ٹیکتے آہستہ آہستہ آ رہے تھے میں نے بغیر دیکھے داؤد کے شبہے میں انہیں دبوچ لیا۔ ان کے ساتھ ایسا واقعہ کبھی کاہیکو پیش آیا تھا۔ بیچارے حیران ہو کر پکارے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں نے آواز سے پہچانا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

مظہر الاسلام۔ بس لاحول کے آگے شیطان کس طرح ٹھہر سکتا تھا خیر قیس سنو یہ جس قدر ابتلاء میں تم گرفتار ہو محض اسلئے ہے کہ تم نے رشتۂ الٰہی کو چھوڑ دیا ہے اس سے مضبوط تعلق پیدا کرو۔ تم پر روشن ہے کہ فقط ہمارا سلسلہ ہی خالص اسلامی خدمت کر رہا ہے۔ صلائے عام ہے بے تکلف شامل ہو جاؤ دیکھو سب مشکلات حل ہو جاویں گی۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالےٰ نے اصلاح کے واسطے مہلت

دیتا ہے لیکن چھوڑتا نہیں۔

قیس ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مظہر الاسلام ۔ نہیں۔ زیادہ تفحص درکار ہے۔ شاید اللہ تمہارے دل کو اپنی تجلی سے منور کر دے آؤ ظریف چلیں پھر سہی۔

ظریف ۔ ذرا توقف کرو۔ کل عشاء میں پیشِ نماز نے قرأت بہت لمبی کر دی میرا دل اُچٹ گیا۔ عین اس وقت ایک عجیب خیال سوجھا۔ یہ جو لیلیٰ کے بزرگ تمہیں بعض نئی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں۔ کیوں نہیں تم بھی درخواست کرتے کہ لیلیٰ کو چار سال کیلئے آگرہ لیڈیز کالج میں داخل کر دیں۔ ذرا قدرِ عافیت تو معلوم ہو اور یوں بھی تو سچ ہے اگر تم اعلیٰ تعلیم پا کر ایک صحرا نشین لڑکی سے تمام عمر کے لئے جکڑ دیئے گئے تو تمہیں تو دنیا ہی دوزخ ہو جائے گی۔ خدا کے لئے میری اس الہامی شرارت کو ضرور پورا کرو۔ سلام علیکم۔

قیس ۔ جناب مظہر آپ کا فرمانا بجا و درست۔ قبلہ مذہبی عقائد میں میں آپ کا ہم نوا ہونا چاہتا ہوں البتہ توفیق عمل نہیں ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(دونوں کو رخصت کر کے قیس پھر خط شروع کرتا ہے)

"........ جو تم انہیں اپنی مشورت سے اور زیادہ ستم آشنا کئے دیتی ہو۔ اس میں کیا مصلحت سمجھی ہے۔ میری صحت کا خیال نہ سہی یہ تو سوچو دنیا داروں کے مضحکہ میں تمہاری طفیل کب تک نہ سر کے

گھونٹ کر کے پیتا جاؤں جب سے ایم۔اے میں داخل ہوا ہوں۔
طرح طرح کے تمسخر برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ لوگوں کی حیرت بجا ہے
مطالعہ کی عمر تو بادیہ پیمائی میں بسر کی۔ ور اب سینگ کٹا کے بچھڑوں میں
آملا ہوں یہ انوکھا تحصیلِ علم کا شوق چرایا ہے بوڑھے طوطے بھی کہیں
پڑھے ہیں لوگ قیاس کرتے ہیں کہ بزرگوں کا اندوختہ کالج کی نذر کر کے
بلا حصولِ مقصد پھر رو بصحرا خاک چھانتا پھروں گا۔ کیونکہ حقیقت
میں اکتساب علم کی عمر تو اب ختم ہو چکی محض ہوس باقی ہے۔ بیشک
لوگ سچ کہتے ہیں لیکن مجھے بھی تو پاسِ وفا نے مجبور کر رکھا ہے۔۔
ورنہ "کجا عاشق کجا کالج کی بکواس" وفا دشمن لیلیٰ! محض تمہاری تیرہ ہٹ یا
پوری کرنے کے لئے گھر پھونک تماشہ دیکھ رہا ہوں"

رقیس اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی نے شانہ پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔
بیچارا اس خیال سے کہ کہیں نووارد پر اس کی بے تابانہ تحریر منکشف نہ ہو گئی ہو۔
اچانک اچھل پڑا۔

نووارد۔ پریشان نہ ہوجیئے میں نے آپ کی تحریر پڑھنے کی ہرگز کوشش نہیں کی
اگرچہ میں دس منٹ سے آپ کی پشت پر کھڑا ہوں۔ لیکن واہ رے انہماک کیا مجال
جو نگاہ کاغذ سے اوپر اٹھے۔

قیس۔ بھائی شعیب تشریف رکھیں اگر اجازت ہو تو یہ خط انہیں لکھ رہا ہوں
ختم کر لوں سبے مجھے آپ سے گفتگو بھی کرنا ہے۔

شعیب۔ ضرور۔

"آہ بچپن میں تمہاری موہنی شکل پر سادی پیاری پیاری باتیں کیسی بھلی
معلوم ہوتی تھیں سنِ شعور کو پہنچکر ستم ظریف ہونا ضرور تھا۔ اور جو دلیت

کردہ تخمِ جور کا نشو پانا لابدی تھا۔ تو کیا یہی تقاضائے مروت تھا کہ اس کی
آبیاری میرا خون سینچ کر ہو۔ دیکھو تم نے تو کمال لاپرواہی سے ایک خواہش
ظاہر کردی اور یہ نہ سوچا کہ تمہاری شعلہ پوش آرزوؤں کا ایک شرارہ
قیس کے خرمنِ ہستی کو خاک سیاہ کر دینے کے لئے کافی ہے میری
صحت آجکل معمول سے زیادہ کمزور ہو رہی ہے۔ ہفتہ میں دو تین دورے
اختلاجِ قلب کے پڑجاتے ہیں ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ گرمی کی تعطیلیں
کسی سرد مقام پر گذاری جاویں میں بھی اس مشورہ سے خوش ہوں کیونکہ
ہر سال تم بغرضِ تفریح کشمیر جایا کرتی ہو میں بھی عذرِ مرض کرتا جا پہنچتا
لیکن سنتا ہوں کہ اب کے تمہارا ارادہ کوہِ دار جلینگ جانیکا ہے کیونکہ کشمیر
کی پے در پے سیاحت سے طبیعت سیر ہو چکی ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط
ہو کیا میں توقع رکھ سکتا ہوں کہ تم اپنا ارادہ بدل کر کشمیر کو دارجلینگ
پر ترجیح دوگی۔ یہ بڑی معمولی التجا ہے اگر اس کی شنوائی نہ ہوئی تو فردائے
قیامت میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ دعاگو قیس۔ یہ خط آج سات
مئی کو حدت تپ میں لکھا گیا۔ حرارت غریزی مقیاس الحرارت کو
ریزہ ریزہ کر دینے کیلئے کافی ہے اور اگر لیلیٰ کو اس کے باور کرنے میں
شبہ ہو تو کیا کہوں حضرت عباس کا علم ہی ٹوٹے کیونکہ تھوڑا سا مبالغہ
تو تقاضائے فطرت انسانی ہے لیکن دروغ مطلق کی تصنیف سے
قیس اور اس کے ہم قوم ہمیشہ پاک رہے ہیں۔

قیس۔ (شعیب سے مخاطب ہوکر) حضرت دنیا میں صفتِ ایثار کی کیوں اس قدر
بے قدری ہوتی ہے؟

شعیب۔ کیونکہ تعلقات انسانی میں ایثار کا قطعی وجود ہی نہیں یہ خود ستا لوگوں کی

وضع کردہ اصطلاح ہے یا یوں کہو کہ ترقیاتِ انسانی کا وہ زریں اصول یعنی شخصی مفاد کی نگاہ داری جسے دل جلے نفس پروری کہکر دل ٹھنڈا کرتے ہیں دراصل ایثار کا مترادف ہے۔

قیس۔ خوب! ایثار اور نفس پروری کو مترادف قرار دینا ہرمزد اور اہرمن میں شانِ ربوبیت کو خلط کرنے سے کیا کم ہے۔

شعیب۔ نہیں نہیں نفس پروری تو ضرور قابلِ نفرین ہے نگاہ داری مفادِ شخصی کیوں نہیں کہتے۔ دیکھیں جسے آپ ایثار سے تعبیر کرتے ہیں اس کا محرک یہی جذبہ ہوا کرتا ہے اگر بنی آدم میں یہ خلقی تحریک نہ ہو تو دنیا میں تمدن کو فروغ کب ممکن ہے آپ لیلیٰ کی محبت کو ایثار کی بہترین محرک اور مستحسن نمونہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اسی میں خود پروری کا مکروہ ترین پہلو نظر آتا ہے ورنہ اس سے آپ کبھی بدرجۂ شرک شغف ظاہر نہ کریں حصول مدعا کے لئے آپ کو انوکھی صعوبتیں بھی اُٹھانی پڑیں تو اس میں لیلےٰ کی خاطر قربانی کا کونسا پہلو نکلتا ہے۔ مقام لیلےٰ تک پہنچنے میں اگر آپکو درمیانی مراحل طے کرنے میں مضائقہ ہو تو جانے دیجئے وہ بیچاری بھی شکر کا کلمہ پڑھے گی۔ آپ ناحق اس کی تشہیر کر رہے ہیں اور اگر ارباب محنت کی طرح جان لڑائیں گے تو اپنا سکون قلب فراہم کرنے کو۔ اس میں لیلیٰ پر کیا احسان۔

قیس۔ ایثار اور خود پروری کو مترادف قرار دیکر دلائل بہم پہنچانے میں آپ جیت جائیں۔ لیکن اس اُونچ نیچ میں مجھے تو محض رنگِ شعریت ہی نظر آتا ہے لیکن یہ ارشاد ہو کہ تعلقات لیلیٰ میں جو خود پروری آپ پر روشن ہوئی ہے اس میں کراہت کا پہلو کہاں سے آگیا؟

شعیب۔ قبیلوں۔ گروہوں اور قوموں کو ترقی کے زینہ پر پہنچانے میں یا اصول طریقوں اور فنون کی ترویج میں جو ایثار آپ کے نکتۂ خیال سے ظاہر ہو اس میں

شخصیت کو نسبتاً بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لیکن آپ تو عطیاتِ رحمانی کو فقط اپنے جنوں کی تکمیل میں ضائع کر رہے ہیں۔ پس ایسی مہمات متخیلہ کو نصب العین قرار دینا اور نسلِ انسانی میں ایسے زہر آلود خیالات کا پھیلانا کیا فرزانگی ہے۔ حضرت آپ تو اپنا عزیز وقت اور بزرگوں کا ترکہ بالکل تباہ کر دامن جھاڑ کھڑے ہو جائینگے پھر بھی خود ستائی سے باز نہ آئینگے ؎

خنک آں قمار بازے کہ بباخت ہر چہ بودش
و نہ ماندش ہیچش الا ہوسِ قمارِ دیگر

قیس۔ جی ہاں درست لیکن نشہ کا علاج اجتناب منشیات تو نہیں حدّت جگر تو زیادہ مے نوشی سے ہی کم ہوگی ورنہ اجل بعیدہ اچانک وارد ہو جائے گی مسٹر ایڈمسن جو کبھی ہم میں سے تھے حال ہی میں ایم اے علم فلسفہ میں پاس کر چکے ہیں اور اپنی معلومات کی دم خم پر مذہبی قیود سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔ ان کے فلسفہ کی ٹکر کا آجتک کوئی عالم نہیں ملا جو نہیں ہستئ باری تعالےٰ کا قائل کر سکے۔ ایک روز عالم سرخوشی میں میری کیفیت اضطرار کا علاج مے نوشی ہی تجویز فرماتے تھے۔

شعیب۔ خیر ان کے مقابلہ پر تو میں آنا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ مفروضہ فرائض کو دیانت سے پورا کرنے سے اور حقوق العباد کو نگاہ رکھنے سے کامل سکونِ قلب میسر آسکتا ہے۔

قیس۔ لیکن اب تو میں اپنا مستقبل ملیا میٹ کر چکا ہوں۔ ساز زندگی بگڑ چکا ہے ملکاتِ فاضلہ خاک میں مل چکے ہیں اعضاء رو بہ انحطاط ہیں اب امیدِ استواری کیونکر ہوسکتی ہے۔

شعیب ؎

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

قیس۔ بھائی وعظ تو سُنا جذب محبت پر بھی کچھ ارشاد ہو۔

شعیب۔ اس مسئلہ پر تو آپ ہی تجربات کی بنا پر خطبۂ بلیغ فرما سکتے ہیں۔ انسانی مقناطیس کا میں بھی قائل ہوں۔ اسی خیال کی عظمت کی بنیاد پر بہت سے مذاہب کی جلیل الشان عمارات استوار ہوئی ہیں۔ قدیم یونان کے دیوتا پرستی کے فسانوں میں منقول ہے کہ ذی روح کی پیدائش ابتداءً بشکل توام ہوئی تھی یعنی مرد عورت جڑے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ بہت عرصے تک وہ جوڑا کامل اتحاد و محبت کیساتھ سیر عالم میں مصروف رہا قدرتی میوے کھانے کو اور درختوں کی چھال پوشش کے لئے کافی تھی لیکن ایک عرصے کے بعد جدت پسند عورت جو کہ آجکل کی طرح ہمیشہ سے جبلاً فیشن کی دلدادہ رہی ہے بدقسمتی سے محسوس کرنے لگی کہ مرد اسکے حسن کی افزائش کیلئے محنت سے وسائل مہیا نہیں کرتا اور خیالات عشق میں ایسا ڈوبا ہے کہ کبھی اسے تمدنی فرائض کا احساس نہیں ہوتا۔ کچھ عرصے تک تو اپنی سریلی تانوں سے مرد کو اپنی خدمت کی تحریص دلاتی رہی لیکن جب اس کا اثر الٹا جنوں بڑھانے کا باعث ہوا تو تنگ آکر عورت نے صمیم قلب سے دعا کی کہ اسے ایسے نااہل قدر ناشناس مرد کا محتاج مسرت نہ رکھا جاوے دعا قبول ہوئی اور دونوں کے جسم ایکدوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ کچھ مدت تک باہمی موانست سے آزاد زندگی گذارنیکے بعد انہیں اتفاقیہ جدائی واقع ہوگئی ابتک مرد و عورت جنہیں قدرت نے ایکدوسرے کیلئے پیدا کیا تھا اپنے ہمزاد کی تلاش میں سرگردان ہیں لیکن نہیں پا سکتے۔

قیس۔ (ہاتھ بلند کر کے) اے رب العالمین۔ اے آفریدگار لیلیٰ۔ اے پروردگار قیس۔ اگر ابتدائے آفرینش میں تو نے لیلیٰ کی دعا کو اس کے لب کشا ہوتے ہی منظور فرما لیا تھا تو اب جبکہ قرب قیامت ہے۔ ہنگام زیست میں سکون خلا آنیوالا ہے اپنے عاجز گنہگار کی کمزوریوں سے چشم پوشی فرما کر دوبارہ مجھ قیس کا جسد خلقی لیلےٰ کے متصور سے پہلے سے بھی بڑھ کر ناقابل گسل استحکام کے ساتھ چسپاں فرما دے۔ آمین۔

پرسش فرہاد و عذرِ قیس

نامۂ فرہاد

مائی ڈیر قیس۔

باعتبار اس خلوص اور تخصیص کے جو تمہاری لیلٰے اور میری شیریں کے درمیان ہے اور مدتوں سے چلی آتی ہے تمہیں معلوم ہے کہ میں کوئی غیر نہیں ہوں۔ پھر اس خلوص اور تخصیص کے بیچ میں مغائرت کا شاخسانہ پیدا کرنا چہ معنی دارد۔ مجھ سے تم سے دوری دور کی علیک سلیک رہی تو کیا مضائقہ ہم تم ہمیشہ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر رہے تو بلا سے آنکھوں سے دور رہنا کوئی شئے نہیں۔ دل سے تو دور نہیں رہے اور اللہ نہ کرے کہ رہیں پھر مغائرت کے القاب اور اینچ پیچ کی باتوں سے ہمیں کیا سروکار۔ اجی اِن سب دور از کار تکلفات کو اُٹھا کے چھپر پر پھینک دو۔

جو احسان تمہاری لیلٰے نے میری شیریں پر کئے ہیں۔ اگر میں اُنہیں بھلا دوں تو احسان فراموش کہلاؤں۔ مگر فرہاد اور احسان فراموش! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ عقل کے ناخن لو! اگر بھولے چوکے کہیں ایسا خیال دل میں آئے تو اسے شیطانی وسوسہ سمجھ کر لاحول پڑھو۔

مجھ سے بڑھ کر تمہیں درد آشنا نہیں مل سکتا چراغ لیکر ڈھونڈو تو نہیں پاؤگے اس درد کی لذت صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے خود اس کی چاشنی چکھی ہو ادیبہا ں چاشنی چکھنی چہ معنی دارد۔ اس علم میں تمہیں بھی سبق دینے کو طیار ہوں۔ لو نمونہ کے طور پر چند سبق سُن لو۔ سُنو اور گرہ میں باندھو۔ یہ اشتیاق۔ یہ بے چینی۔ یہ تڑپ اور یہ پریشانی رفع

ہونے والی شئے نہیں ہے۔ اللہ وہ دن جلد لائے گا جب میری طرح تم بھی شاہدِ مدعا سے ہمکنار ہو گے۔ تب اس قول کی صداقت دیکھنا۔ صرف وہی چاہ اور محبت جس کا نام بوالہوسی ہے وہ تو البتہ ایک خاص حالتِ منتظرہ کے جاتے رہنے پر ٹھنڈی پڑ جاتی ہے مگر حقیقت میں ایسی چاہ چاہ نہیں اس کا نام بوالہوسی ہے۔ جس کا نام محبت ہے وہ سیر ہونا ہی نہیں جانتی۔ بوالہوسی کی مصنوعی چاہ مرورِ ایام سے سرد ہوتی چلی جاتی ہے اور آخرکار فنا ہو جاتی ہے مگر وہ حقیقی چاہ جس کا نام محبت ہے اسے فنا کہاں! وہ تو بڑھتی ہی جائے گی۔ وہ تمام آلائشات اور خواہشات سے پاک ہے۔ کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ کوئی خاص پیاس نہیں رکھتی جس کے بجھنے کے ساتھ ہی خود بھی بجھ جائے۔ میری شیریں آج کل مجھ سے دور ہے اور اس کی فراق کی کڑی کڑیاں جھیلنے میں میرے سامنے بھی وہی بلائیں ہیں جو اس وقت تمہاری لیلیٰ کے فراق میں تمہارے سامنے ہیں ۔

جب مَیں تمہارا درد آشنا ہوں اور تخصیص کے بھی سارے مدارج طے کر چکا ہوں تم سمجھ سکتے ہو کہ مجھ سے بڑھ کر دوسرا بھی خواہ تمہیں نہیں مل سکتا تو پھر کیوں مجھ سے دور بھاگ رہے ہو؟ ان باتوں کے علاوہ میرے دل میں خواہش بھی ہے کہ تمہارے کام آؤں پھر آخر وہ کون سی شئے ہے جو تمہیں مجھ سے کھل کر مل جانے سے مانع آ رہی ہے! مَیں اور تم دو نہیں ہو سکتے ہیں جو کچھ ہؤا سو ہو گیا اس کا گلہ نہیں ہے

درمیانِ ہمنشیناں ماجرائے رفت رفت

مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے تم چاہو تو آج ہی بگڑی بات بن سکتی ہے ۔

میں ہر طرح تمہارے لئے طیار ہوں۔ تمہارے کام کو عین اپنا کام سمجھ کے کرونگا اگر مجھے کسی بات کی ضرورت ہے تو بس اتنی ہی کہ تم مجھے سب سے پہلے اس امر کا یقین دلا دو۔ کہ جو میں چاہوں تم مجھے کرنے دو گے اور منہ پھلا کے بگڑ نہ بیٹھو گے

کیونکہ میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ تم مجھ سے خفا ہو جاؤ۔ لہذا تم مجھے فوراً ہی اس کا جواب دو اور صاف صاف بے تکلف لکھ دو کہ تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرتے ہو۔ اگر تم مجھے اپنا وکیل کرو گے تو میری شیریں بھی بلا فیس تمہاری وکیل ہو جائیگی اور ہم دونوں ملکر تمہارا معاملہ روبراہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اب اگر مگر نہ کرو اور معاملہ ہمارے ہاتھ میں چھوڑ دو ہم دیکھ لیں گے ؛

تمہارا مخلص

فقیر فرہاد ہندی

عذرِ قیس

فرہادِ کامگار۔

آپ کی توجہ نے دل میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے اگرچہ ابھی تک تو بلا انتخاب لیلیٰ ہی زندگی گذاری ہے لیکن اب جبکہ ارباب محنت کے سرگروہ سے ایسے ہمت افزا کلمات سُنے ہیں۔ تو شعریت کے رنگ میں لیلیٰ سازی کی دل میں ٹھانی ہے آپ لیلے سازی کی اصطلاح سے حیران ہوں گے یقین فرمائیں کہ قیس کو ابھی تک کسی پیکرِ محسوس سے سابقہ نہیں پڑا۔ محض آپ کے سبز باغ دکھانے پر ممکن ہے اسکے دل میں بھی آپ کی طرح شاہدِ مقصود سے وصال کا شوق چرائے لیکن آپکی تلقین سے اثر پذیر ہو کر اُسے کاہشِ خیال سے پہلے ایک صنم تراشنا پڑے گا جس کے سامنے ہزار آرزوؤں کے ساتھ وہ بھی آپ کی طرح سجدہ ریز ہو مگر اس مشقتِ لیلے سازی میں بھی وہ عام گردہ عشاق کی طرح خود شناسی کے مادۂ روح پرور کو ہرگز سلب نہیں ہونے دیگا۔ بلکہ ابوالبشر کی رسم کہن کو تازہ کر کے بتِ لیلے کو اپنے ہی پہلو سے تراشے گا یقین ہے کہ قیس کو اس آفریدۂ خیال لیلیٰ میں وہ تمام جلوے نظر آئیں گے جن کے نظارے نے فرہاد کو معلم عشق ہونے کی بصیرت بخشتے ہوئے

قیس جیسے گرگ باراں دیدہ کو مرہونِ منت کرنے کی جرأت دلائی ؎

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش ہم صنم اورا شوم ہم آذرش

سنئے حضرت میں حیاتِ جذبات کے ساتھ انسانی زندگی کو وابستہ سمجھتا ہوں جذبات کی موت انسان کی اخلاقی موت ہوا کرتی ہے۔ پس میں تو مدت ہوئی احباب کے لئے مرچکا ہوں۔ اور چونکہ موت ہزار ارمانِ حسرت زا کے ساتھ ہوئی تھی اس لئے مرنے کے بعد بھی عقوبتِ جہنم کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ عنقریب اس دوزخی مقام سے ایک مکتوب تمام خیالی لیلاؤں کی تشحیذِ ذہنی کی غرض سے بھیجنے والا ہوں۔

زندگی میں لیلائی گروہ سے اگر تنفر نہیں تو مغائرت ضرور تھی۔ میری اس مرگ اور تنہائی میں دوستوں کی پرسشِ احوال بہت بیزار کن رہی ہے۔ آخران کے اصرار سے تنگ آکر اپنا رونا مخزن میں رو دیا تھا۔ چونکہ ایسی تحریر ایک مطمح نظر کی محتاج ہوا کرتی ہے پس قیس کی رعائت سے لیلے موہوم کو کہیں کہیں مخاطب کیا گیا ہے احباب کو اس تحریر سے میرے متعلق بہت بدگمانی پیدا ہو گئی ہے حالانکہ میں تو ایسی لغزش سے بالکل معصوم ہوں فریب خوردہ خود میرے کرم فرما پُرسانِ حال ہی ہیں۔ سوچو تو سہی اگر چودھویں صدی کا فرہاد روایات کے خلاف شیریں کام ہو سکتا ہے تو آجکل کا قیس بلا لیلیٰ وحشت اثر زندگی کیوں نہیں گذار سکتا۔ حضرت اب تک تو میرا قلب پر میرے جذبات کے مجموعۂ اثرات ہی میری لیلے ہوا کرتے تھے اور پیوستہ عزلت گزینی اور دوامی وحشت خیالی نے مجھے بغیر لیلے گذرانِ اوقات کا ڈھب سکھا دیا ہے۔ فرہاد کے نکتۂ خیال سے تو میری لیلیٰ بھی اس کی شیریں کی طرح کیسی شیریں؟ ایرانی صبر آزما شیریں نہیں بلکہ خلاف فسانۂ ماضی نہایت ہی وفا پرور شیریں! کوئی پیکر لطیف ہونی چاہیئے تھی۔

لیکن آہ قیس تو کچھ زمانے کی ستم ظریفی کی طفیل کچھ ریاضتِ نفس کی بدولت

عالمِ محسوس سے بلند ہو کر فضائے تخیّل میں اپنی چند روزہ ارضی زندگی کے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے کبھی کبھی وجدانی کیفیات سے مجبور ہو کر اپنی سفلی زندگی کی یاد میں دنیا والوں کے استعارات سے کام لے کر اپنے آپ کو محظوظ اور انہیں دھوکا دیتا رہتا ہے۔ خدا کے لئے آپ اس فریب میں نہ آئیں ورنہ قیس کے لیلےٰ کُش جذبات سے متاثر ہو کر آپ بھی شیریں کی مرگِ نشاط کا باعث ہوں گے۔ کیونکہ قیس آپکو سنجیدگی سے یقین دلاتا ہے کہ جو بدنصیب لیلیٰ بھی اس کے عقد میں بطریقِ لاٹری آئے گی بہت قلیل مہلت یکجائی میں قیس کی عزلت پسند و افیون اثر افتادِ مزاج سے تنگ آکر اپنی زندگی سے بیزار ہو جائے گی۔

پس حضرتِ فرہاد کی خدماتِ فطری کا اپنے تئیں نااہل سمجھتے ہوئے ہزار شکریہ کے ساتھ عرض پرداز ہوں کہ اگرچہ قیس نجدی کے لئے آپ کی توجہ زندگی بخش ہو۔ لیکن قیس پنجابی (جس کا دماغ کالج کی کتابوں نے خشک کر دیا ہے) کو چنداں سود مند نہیں۔ البتہ فرہاد کی جبلّی ہمدردی نے نامۂ فرہاد کے مطالعہ کے وقت قیس کی آنکھوں کو پُرنم کر دیا تھا۔ اور یہی خراجِ تحسین حضرت فرہاد کو قبول کرنا چاہئے۔ دالّا اگر افراطِ مروت سے مجبور ہو کر فرہاد نے اپنے تجرباتِ زندگی پر بھروسہ کرتے ہوئے بچارے قیس پر کچھ کرم کرنا چاہا۔ تو اس طرف سے بجائے اظہار تشکر کے شائد قیس و فرہاد میں ہابیل و قابیل کا قصہ پیش آئے۔ جس کی خون آشام یاد سے آنے والی نسل وداعق کو آئینِ وفا سے بالکل بے بہرہ رہنا پڑے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

(دعا گو قیسِ باغی)

عتاب نامۂ فرہاد

حضرت قیس۔

آپ کا خط میرے مطالعہ میں تھا اور ہے۔ میں نے لاکھ سر مارا مگر اب تک اُس کا مطلب خاک سمجھ میں نہ آیا۔ اگر میں اپنے الفاظ میں سارے خط کا مضمون بیان کرنے کی کوشش کروں۔ تو شائد قریب قریب یہی الفاظ ہوں گے "میں ایک وحشی آدمی ہوں نہ مجھے شادی کی تمنا ہے نہ لیلےٰ کا اشتیاق۔ اب اگر مجھے لیلےٰ بیاہے گی تو بہت پچھتائے گی" اس کے بعد کچھ کوسا کاٹی بھی ہے جس کا بہت بڑا حصہ میری پیاری شیریں کے دشمنوں پر پڑتا ہے اور کچھ بوچھاڑ مجھ غریب پر بھی پڑ جاتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا اللہ بھلا کرے کہ اُنھوں نے پنجاب میں ایک نرالی ٹکسال کی اُتھو کی بنا ڈالی ہے جو نہ فارسی ہے نہ اُردو۔ ہاں نصیر الدین حیدر مرحوم کے وقت میں اس کینڈے کی اُردو یہاں بھی رائج تھی۔ مگر اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب نہ یہاں کوئی ایسی زبان بولتا ہے نہ لکھتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ یہاں کے لوگ کوثر سے دُھلی ہوئی لکھنوی زبان کی شیرینی سے چٹخارے بھرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ سیدھا سادہ روزمرہ۔ وہ پیارے پیارے دلکش الفاظ جو آجکل کی زبان کے لئے مخصوص ہیں۔ ایک صدی پیچھے کی زبان نہ یہاں کوئی بولتا یا لکھتا ہے نہ سمجھتا ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ فارسی اور فارسیت پر لوگ دل و جان سے قربان تھے۔ ایک آج کا زمانہ ہے کہ اس سے لوگ یوں بھاگتے ہیں۔ جیسے لاحول سے شیطان!

آپ تو پنجابی نہیں ہیں۔مگر پنجاب میں ایک مدت رہنے سے کوئی اپنے وطن کی بات اپنی مادری زبان نہیں بھلا دیتا۔ مجھے نہ آپ کی زبان پر اعتراض کرنے سے غرض ہے اور نہ اس سے بحث ہے کہ آپ ہندوستانی ہوکر پنجابی طرزِ تحریر کے کیوں گرویدہ ہیں۔مگر سخت مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ آپ کے خط کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا۔خط پڑھتا ہوں تو فارسی بندشوں اور فارسی ترکیبوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر نفس مطلب سے کوسوں دور پہنچ جاتا ہوں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔آخر مجبور ہوکر اس عقدۂ لاینحل کو آپ ہی سے حل کراتا ہوں ؎

ان تحریرات کا جہاں تک مَیں مطلب اخذ کرسکا ہوں صرف اسی قدر عقل کام دیتی ہے کہ آپ کو میری مداخلت دراندازی معلوم ہوتی ہے اور آپ ایسی ہمدردی اور ایسی خدمت کی نہ ضرورت رکھتے ہیں نہ خواہش۔جب یہ صورت ہے تو میری دراندازی بالکل ہی فضول اور بے محل ہے۔اور میرے لئے مناسب یہی ہے۔ کہ ساکت رہوں۔اگر میں نے آپ کی تحریرات کا مطلب غلط سمجھا ہے تو اسے آپ ہی سمجھا دیجئے۔میری عقل تو خاک کام نہیں دیتی ؎

اس اظہارِ ہمدردی اور خلوص اور شوقِ خدمت کے صلہ میں کوسا کاٹی کی چھٹیا کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ممکن ہے کہ یہ میری سمجھ یا نامکمل تعلیم فارسی کا قصور ہو۔اگر یہ بات ہے تو آپ کے آئندہ خط سے اس کی صفائی ممکن ہے اگر آپ پسند فرمائیں۔مَیں اس کا منتظر رہوں گا ؎

ناحق چوٹ جولاہا کھائے
کرگہ چھوڑ تماشے جائے

شکرگذار

فقیر فرہاد دہلوی

عرضِ قیس

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

جناب فرہاد۔

آپ کا آتش بار خط پیش نظر ہے۔ اول تو معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی کے سبب میری تحریر سے تکلیف پہنچی۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں اگر آپ کی شیریں کے متعلق کوسا کاٹی تو یک طرف فریبِ داستان کے خیال سے بھی کوئی نازیبا بات نکلی ہو۔ البتہ فرہاد کے متعلق اگر کچھ شوخی ہوگئی ہو تو اِتنا تو قیس کا حق بھی ہونا چاہئے آپ کسی حد تک میری تحریر کو درست سمجھے ہیں واقعی "میں ایک وحشی آدمی ہوں" اور میں ہی کیا ہندوستانیوں کے نکتۂ خیال سے میری ساری پنجابی برادری ہی وحشیوں کی ہے "نہ مجھے شادی کی تمنا ہے نہ لیلےٰ کا اشتیاق"۔ بالکل بجا جب تک طالب علم ہوں۔ شادی کا تصور ہی سوہانِ روح ہے اور لیلےٰ سے تو قسم لے لو۔ کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا۔ نہ بالمشافہ نہ خیال میں۔ ہاں "اگر لیلی مجھے بیاہے گی۔ تو بہت پچھتائے گی" کیونکہ میں تو لیلےٰ کے وجود کا ہی قائل نہیں۔ اور اگر بفرضِ محال فرہاد کی مشقتہائے کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کوئی لیلےٰ نما ذی روح میرے گلے تھوپ دی گئی۔ تو وہ فرہاد کے پیش کردہ فریب محبت سے بہت پچھتائیگی کیونکہ فرہاد اپنی خلوصِ نیت کی وکالت میں جو میرالقشۂ عشق و بیقراری پیش کرینگے وہ دراصل محض مخزن کے ناظرین کو بہلانے کے لئے ہوگا نہ کسی معصوم لڑکی کو دھوکا دینے کی غرض سے۔

عارف باللہ اقبال کے آپ ہی پہلے مخالف نہیں سب سے پہلے ان کے خلاف حضرت حسرت اپنا زورِ قلم دکھا چکے ہیں۔ ہندوستان (گنگا جمنی) والوں کی مخالفت ہمارا ایمان مضبوط کر رہی ہے۔ نصیر الدین حیدر مرحوم کا زمانہ مبارک تھا جبکہ اُردو کی نشوءِ حیات فارسی سے ہُوا کرتی تھی۔ فارسی کا سسکتا ہُوا مریض اودھ سے نکالا گیا۔ پنجابیوں نے اپنے حسنِ اخلاق سے اسے گرویدۂ احسان کر لیا۔ اب رو بصحت ہے۔ آپ تو اسے مرحوم گردان چکے ہیں لیکن پنجاب میں حضرتِ اقبال اور اُن کی اُمت نے اُسے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اب بھلا چنگا پھنپھناتا ہوا جوانِ رعنا نکلتا آتا ہے۔ آہ جسے آپ طنزاً ایک صدی پہلے کی اُردو سے یاد کرتے ہیں وہی آپ کے درمیان مخفی عملِ قلب ماہیت سے ہندی کنیا بن گئی ہے۔ آپ کو مبارک ہو ہمیں اپنے ایرانی جوان سے بقائے نسل کی اُمید ہے لیکن ہندی کی اولاد اپنے لئے مستقبل میں کوئی نام تجویز نہ کر سکے گی۔ خدا نہ کرے کہ ہماری زندگیوں میں وہ اپنا امتیازِ نسلی کھو بیٹھے۔

آپ نے اقبال کی اسرارِ خودی کا دیباچہ مطالعہ فرمایا ہو تو سمجھ لیں ہم پنجابیوں کے لئے وہی نثر کا عمدہ نمونہ ہے اور جیسے ہم اقبال کے خیالات کو الہامی مانتے ہیں ویسے ہی ان کی زبان کو بھی الہامی سمجھتے ہیں۔ زبان کو ترقی و عروج اگر آب ہوا سے ہوتا ہو تو بھی اس کا مستحق پنج آب کا روح پرور حسن آفریں شعر خیز خطہ ہی ہونا چاہئیے۔

پچھلی صدی میں اردو دہلی و لکھنؤ میں اربابِ ذوق کے یکجا جمع ہو جانے اور خاندانِ شاہی کی نظرِ کرم کے سہارے بڑھی اور پھلی پھولی تھی۔ اب وہ بزم ہی درہم برہم ہو گئی۔ زمانے نے اپنی ستم ظریفی سے ابنائے وطن میں سے اردو کے دشمنوں کو ہندوستان کی ورنیکلر کا مربی قرار دے دیا۔ اور اس پر ستم یہ ہوا کہ اُردو کے

ہواخواہ زمانے کی چال سے متاثر ہو کر فارسی سے بیزار ہو گئے اور انہوں نے اُردو کو فارسی سے پاک کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ برخلاف اس کے پنجابیوں نے اُردو کو زہریلے اثرات سے بچانے میں سعی فراواں دکھلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اب وہی اُردو کے مالک ہیں جس طرح جس لباس میں چاہیں پیش کریں دُنیا کو قبول کرنا ہو گا۔ رہی حضرتِ اقبال کی اُردو۔ تو ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ اقبال جو کچھ کہتے ہیں بالقائے ربانی کہتے ہیں ہمارے لئے سند ہے۔

آپ کی ہمدردی کا نہایت مشکور ہوں۔ مگر عرض ہے کہ مخزن کی خیال آرائیاں محض کلفتِ مطالعہ دور کرنے کی غرض سے ہوا کرتی ہیں۔ ورنہ پنجاب کی آب و ہوا عشق آفرین کہاں! البتہ بقول آپ کے وحشت خیز ضرور ہے۔ خدارا مجھ پر مکرر اتنا عتاب ظاہر نہ فرماویں۔ سوچتا ہوں یا اللہ میں ناکردہ گناہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اچھے خاصے طالب علم کو لوگوں نے سچ مچ مجنوں ہی بنا دیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ قیس کی وحشت خیالیاں قانون کے سنجیدہ مواخذہ سے بھی قطعی آزاد ہوں گی کیونکہ دیوانہ کو دنیا کے کسی گوشہ میں دانایانِ زمانہ کی مسلسل دماغ سوزی سے وضع کردہ ضابطۂ تعزیرات اپنے ہمہ گیر شکنجۂ عقوبت کی گرفت میں لانے سے عاجز ہے چہ جائیکہ فرہاد جیسا جنوں آموز ہی بیچارے قیسِ صحرائی کو قیدِ سلاسل میں کرنے کے درپے ہو جائے اور "عذرِ قیس" پر اس قدر خشمگیں ہو۔ اب تک تو حالتِ اضطرار میں یہ شعر وردِ زباں ہوا کرتا تھا ؎

این وصیت کرد مجنوں در دمِ آخر بمن

تا توان دیوانہ شد فرزانہ بودن خوب نیست

معتوب علیہ۔ قیس پنجابی

بہن بھائی کی خط و کتابت

لدھیانہ

۲۱- جولائی ۱۹۱۶ء

قبلہ ام بھائی جان- آداب عرض- مجھے تو شائد آپ نے مردہ ہی تصور کر لیا ہے- مہینوں گذر جاتے ہیں- اور یہ منتظر آنکھیں کبھی آپ کی تحریر سے آشنا نہیں ہوتیں- کالج میں اکثر تعطیلیں ہوتی رہتی ہیں لیکن تعجب ہے کہ آپ وہ فراغت کا قلیل زمانہ بھی بورڈنگ ہاؤس ہی میں گذار دیتے ہیں حالانکہ اسی شہر میں نرگس خاتون کے میاں دو چھٹیاں بھی غنیمت سمجھ کر گھر دوڑے آتے ہیں اور دو روز کالج سے غیر حاضر ہو کر چار دن ضرور گھر گذار جاتے ہیں- نہ معلوم آپ نے اپنے عزیزوں کی طرف سے دل اس قدر سخت کیوں کر لیا ہے دنیاوی تعلقات سے نفرت سہی لیکن خونی رشتے تو آپکے توڑے ٹوٹ نہیں سکتے- آپ خط نہ لکھنے کا عذر ہمیشہ عدیم الفرصتی کہا کرتے ہیں لیکن جس مختصر سی فرصت میں دبی خیال آرائیاں ہوا کرتی ہیں چند منٹ اس کنیز کے لئے بھی نکل سکتے ہیں- بھلا دو چار چھٹیاں تو آپ نے کالج میں رہ کر گذار دیں لیکن یہ کیا خیال سوجھا ہے کہ گرمی کی لمبی تعطیلوں میں بھی گھر والوں کو ترساتے رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے- بھائی جان مجھے ڈر ہے کوئی عالم مجسم لیلےٰ تو آجکل لاہور میں قیام پذیر نہیں جس کی وجہ سے آپ کو لاہور کیساتھ خاکِ نجد کی سی الفت پیدا ہو گئی ہے-

آج صبح ابا جان اور بی اماں میں دو گھڑی تک سرگوشیاں ہوتی رہیں کئی دفعہ بی اماں نے ٹھنڈی سانسیں لیں- ابا جان نے زانو پر ہاتھ مارے- ننھا زمرد بی اماں کی گود میں اس کیفیتِ ملال سے متاثر ہو کر رونے لگا میں اگرچہ جانتی تھی کہ یہ تمام

افکار آپکے ڈالے ہوئے ہیں اور حقیقت کچھ بھی نہیں پھر بھی گھر کا سماں ایسا بگڑا دیکھ کر
میرا دل بھی اُچھلنے لگا۔ حقیقت میں بھائی جان یہ آپ نے بیٹھے بٹھائے ہم سب کو
کیوں پریشان کر دیا کیا مضمون نویسی کیلئے کوئی اور عنوان نہ سوجھا جو نگوڑی لیلیٰ کی
داستان چھیڑ کر بی اماں کو آٹھ آٹھ آنسو رلوایا۔ ابا جان الگ آگ کھا انگارے لوٹ
رہے ہیں۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ مخزن کے ناظرین علیحدہ کچھ کا کچھ مطلب تراش کر آپ کے
اخلاق کے متعلق طبع آزمائیاں کر رہے ہیں۔ آج صبح کی مشورت کا نتیجہ آپ کو سناتی
ہوں۔ ابا جان بہت بگڑ رہے ہیں اور تہیہ کر لیا ہے کہ بہن عذرا سے آپ کی شادی
فوراً کر دی جائے تا کہ بیوی کا جُوا گلے پڑنے سے آپ لیلیٰ کے جنون سے دست بردار
ہوں۔ نہیں تو انہیں خیال ہے کہ آپ اس ادھیڑ بُن میں اللہ نہ کرے کالج کی تعلیم
سے رہ جائینگے۔ مگر بھائی جان میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ عذرا آپ کی تعلیم سے فارغ
ہونے سے پہلے بھابی جان بن کر ٹھسّے سے ہمارے سر پر آبیٹھیں کیونکہ اب اگر کج
فہم لوگوں کے سمجھائے بجھائے سے ابا جان کو خیال پیدا ہوا کہ لیلیٰ کا تصور آپکی تعلیم میں
ہارج ہوگا۔ تو خیر اسکی بنا تو محض وہم پر ہے لیکن اگر عذرا خاتون آپکے گلے کا ہار ہو گئیں تو
بیشک آپکی علمی زندگی کا خاتمہ ہے۔ خدا نہ کرے جو زمانۂ طالب علمی میں ہی آپ بھی شمشاد
بھائی کی طرح زن مرید مشہور ہو جائیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو نہ سمجھیں بوجھیں
بھائی کی خانہ آبادی کی فکر میں بغیر بھائی کی مرضی معلوم کئے ماں باپ کے سر پر بہو کو
لا بٹھاتی ہیں دو چار دن تو خوب چاؤ چونچلے ہوتے ہیں۔ سوہاگ کا منہ ٹیڑھا دلہن کو
پیرزادی بنا کر چھپر کھٹ پر جکڑ دیتی ہیں اور آپ بے دام کی باندی کی طرح آگے پیچھے
خدمت کو ٹری پھرتی ہیں۔ مگر جہاں دیکھا کہ بھائی جان بھی نئی نویلی دلہن پر ریجھ گئے
تو بس گھوس ہی ہی بیز بجلی شروع ہو جاتی ہے ہی دلہن آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے اس
بیچاری کی دشمنی میں بھائی سے بھی بگاڑ شروع ہو جاتا ہے اور بھاوج کو تو ایسی جلی کٹی

جہاں دُکھیا کمبختی ماری کو پانی نہ ملے +

آج صبح کی ڈاک میں میری سہیلی کنیز اسلام کا خط آیا ہے وہ بچاری نیکبخت تہجد گذار بھلا مغربی طرز تحریر کو کیا سمجھیں آپ کا سلسلۂ مضامین دیکھ کر بھونچکاسی رہ گئی ہیں۔ ان کے اسلامی جذبات کو "پیامِ قیس" کے مطالعہ سے بہت صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی آپ ہی کر سکتے ہیں میں تو حیران ہوں کہ کیا جواب دوں یہ ریاضی کا سوال تو ہے نہیں کہ ایامِ مکتب کی طرح اگر بہن کنیز اسلام کو نہ آئے۔ تو میں حل کر دوں یہ تو مضمون فہمی ہے جو بات کہ ان کے مذہبی نکتۂ خیال میں نہیں سما سکتی میں سے کس طرح ان کے دماغ میں ٹھونسوں۔ اللہ میاں ہی عرش سے اُتریں تو شائد ان کی تسلی کر سکیں مجھ سی وال فرنگیوں کے سکول میں پڑھی بھلا ایسی فضیلت مآب بہن کو کیا کہے کہ بہن عقل کے ناخن لو بہشت و دوزخ کے مادی نقشہ پر توجب مدرسہ میں میری آپ کی بحث ہوا کرتی تھی۔ تو آپ فرمایا کرتی تھیں کہ "تکلم الناس علیٰ قدر عقولہم" کے مصداق جہلائے عرب کو سمجھانے کے لئے دائمی عشرت کا نقشہ اُنہیں کیفیات میں پیش کرنا مناسب تھا کہ جن حالات کو وہ ریگستانِ عرب میں رہ کر نعمت تصور کرتے تھے اُنہیں ان کے خیال میں جنت الماوےٰ میں بھی ہمیشہ کے لئے میسر آسکیں پس اگر مخالفین حرف گیر ہوں تو پڑے ہوں یہ ان کے فہم کا قصور ہے اسلام اسکے لئے ذمہ وار نہیں"۔ پس اگر بھائی قیس نے ناظرین کی طبائع کا میلان دیکھ کر ایک فرضی مضمون لکھ مارا تو کیا گناہ کیا کہ ان کے دشمنوں کے لئے اب دنیا کے کسی گوشہ میں امان ہی نہیں ہونی چاہئے۔ بھائی جان خط کی نقل سے آپ خود اندازہ کر لیں گے کہ آپکی خوبیِ تحریر نے کیا کرشمے دکھلائے ہیں :-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

راولپنڈی

۲۲- جولائی ۱۹۱۶ء

مخدومہ معظمہ ہمشیرہ بنت عامر صاحبہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ: آپکا خط کئی روز سے نہیں ملا تھا طبیعت آپ کی طرف سے تو متفکر تھی ہی کہ آج صبح زنانہ درس کے دوران میں اباجان نے آپ کے بھائی قیس کا ذکر بڑے افسوس کیساتھ کیا کہ ایسا جوانِ زیرک اور یوں ابتلا میں گرفتار ہو چونکہ تمہارا بنتِ عامر کیساتھ بہناپا ہے اس لیے تم بھی دعا کیا کرو اللہ تعالےٰ اس خاندان کو دنیاوی مصائب اور بے آبروئی سے محفوظ رکھے اور قیس کو نیک ہدایت دے۔ بہن کیا کہوں انکے ان کلمات نے میرے دل پر کیا اثر کیا۔ اسی وقت مخزن منگوا کر پڑھا اور سُن ہو گئی! یا اللہ، یہ بھائی نے کیا کیا اگر خیالات ایسے ہی پراگندہ ہو گئے تھے تو انہیں عام کرنے کی کون ضرورت تھی یہ حصولِ مدعا کا بازاری طریقہ اُنہیں کس نے بتایا۔ کیا دوستوں سے ان کے مرض کا مداوا نہیں ہو سکتا تھا جو پبلک میں اپیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اوّل تو عشق عاشقی کے فسانے پڑھنے سے شریف انسان کو عار ہونا چاہیئے چہ جائیکہ وہ تمام کیفیات اپنے اوپر وارد کر کے فخر کیا جائے۔ بہن کیا آپ کو یہ شرک فی التوحید نہیں معلوم ہوتا کہ جو محبت اور عشق ذاتِ واحد کیساتھ ہمیں بتقاضائے فطرتِ اسلامی ہونا چاہیئے ہم وہی جذبات خاکی انسانوں کی پرستش پر ضائع کریں۔ آہ مسلمان جو کبھی وارثِ توحید ہوا کرتے تھے اسلاف کے لئے باعثِ ننگ ہو رہے ہیں جس درد کیساتھ وہ مضمون لکھ کر ایک عالم کو گمراہ کرنیکے علاوہ خود بھی رسوائے جہاں ہوئے کاش کسی شرعی مسئلے پر دماغ سوزی کر سکتے اخلاقی حسنات ہوتے اور غضب یہ کہ اس محکمۂ لغو میں بھی اُنھوں نے دیانت سے کام نہیں لیا۔ اپنے ہی دوستوں پر پھبتیاں اُڑا کر دل میں خوش ہو لئے۔ یہ نہ سوچا کہ ہر ایک درخت

اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اگر ان کے دوست قابلِ نفرین زندگی گذار رہے ہیں۔ تو یقیناً وہ بھی اسی زمرے میں شامل سمجھے جائینگے۔ پھر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو کر آپس میں ٹکرانے سے اپنا ہی سر پھوڑیں گے۔ ہائے بیچارے حاجی جو شخص کے مذہبی وجدان پر کیسی بے دے کی ہے۔ ظریف نہ معلوم کون انسان ہے جسے نہ مذہب کی تکریم نہ بزرگوں کی لاج نہ متانت سے لگاؤ۔ اور پھر اپنے تئیں مسخرہ کہلوا کر خوش ہوتا ہے گویا کہ اس کی وقعت اسکے اپنے دوستوں میں ایک معمولی بھانڈ سے زیادہ نہیں جو تمسخر اُڑا کر نقلیں کرکے بھروپ بھر کر پیٹ پالتا ہے اور دنیا کو اپنے اوپر ہنساتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف مجھے لیلےٰ کے نام خط پڑھ کر ہوئی بہن سچ بتانا قیس صاحب کے حواس تو بجا ہیں؟ یہ جو انہوں نے کسی عصمت مآب پردہ نشین کی یوں سرِعام ہجو کی اس سے ان کا اصلی مقصد کیا تھا کیا ہندوستان کے نسائی تمدن کی صرف ہجو مقصود تھی۔ یا کوئی شخصی مفاد متصور تھا۔ بہن میں نے تعجب سے مضمون پڑھا ہے برابر آپکے خاندان کے لئے بارگاہِ رب العالمین میں دعا کر رہی ہوں۔ اے اللہ پاک تو ہی قیس صاحب کے دماغی سقم کو درست کر اور اُنہیں تزکیۂ نفس عطا فرما قوتِ ایمان بخش اور انہیں مع لواحقین کے بُرے آدمی سے محفوظ رکھ۔ آمین ثم آمین۔ آپکو مطلع کرنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس شخص کے لئے دعا کی جائے اسے بتا دینا چاہیئے تاکہ اُسے بھی اس امر کا احساس ہو اور عملِ نفس کے ذریعہ دعا کا اثر فوری ظاہر ہو۔ آپ بھی دعا کیا کریں۔ اگرچہ مکتب کے زمانہ میں تو آپ پیانو بجانے پر نماز و دعا سے زیادہ وقت صرف کیا کرتی تھیں امید ہے اب بفضلہٖ عمر پیانو بجانے کا مرض تو کم ہو گیا ہو گا۔ سنو بہن ہماری روح کی ابدی حیات کے دوران میں دنیا کا مختصر سا قیام ایک باریک سا رخنہ ہوا کرتا ہے پس اس قلیل مہلت میں دل کو دنیا و

آلائشوں سے پاک رکھ کر حیات بعد الموت کے تصور میں تزکیۂ نفس میں سعیٔ بلیغ کرتے
رہنا چاہیئے۔ آخر آپ نے اس مالکِ کُل کے حضور پیش ہونا ہے جہاں پیانو کے
دلنواز سرود کے بجائے صوم وصلوات کا جادو ہی کام آئے گا۔ والسلام

دعا گو

کنیزِ اسلام"

بھائی خدا کے لئے آپ ہی فرماویں میں اس تادیبی وعظ کا کیا جواب دوں
اگر اس اُلجھن سے اپنے تئیں بچانے کے لئے خاموش ہو رہتی ہوں تو مجھ پر بدخلقی
کا اور اللہ جانے کیا کیا الزام عاید ہوتے ہیں اور جو جواب دوں تو پھر سوئے ادبی کا
خیال ہے کہ دورانِ صفائی میں خدانخواستہ میری قلم سے کوئی کلمہ سہواً بھی ناموافق
نکل گیا۔ تو میرا جہنم سے ورے کہیں ٹھکانہ نہ ہوگا۔ بھائی جان میں تو مذہب کو اخلاقی
امراض کے لئے دوا سمجھتی ہوں۔ غذائے حیات نہیں سمجھتی۔ کیونکہ بہن کنیزِ اسلام
کی مثال میرے سامنے موجود ہے کہ ان کے مذہبی جنوں نے اُنہیں ایک حد تک
کج بحث اور بددماغ کر دیا ہے اب توان کی زندگی میں سوز ہی سوز باقی رہ گیا ہے
جس چار دیواری میں وہ محصور ہیں وہاں کسی رخنۂ فصیل کے رستہ بھی نوائے طرب
نہیں پہنچ سکتی۔ مذہبی ہیجان نے فنون لطیفہ سے اُنہیں بالکل بیگانہ کر دیا ہے۔
اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی ظاہر بین آنکھ پر مذہبی عینک اُنہیں ادبی دُنیا کے لطائف
وظرائف کو دھندلے رنگ میں دکھاتی ہے۔ ہاں بھائی جان اگر گستاخی معاف ہو تو
اتنا میں بھی عرض کرونگی کہ ایسا مضمون ہندوستان میں بیٹھکر لکھنا آپکی اصولی غلطی تھی کیونکہ
ہماری ادبی فضا ابھی توہمات اور قدامت پسندی کے مہلک اجرام سے مکدر ہو رہی ہے اسلئے
ساکنانِ ارضِ ہند کسی چیز کو اصلی صاف رنگ میں دیکھنے سے قدرتی طور پر معذور ہیں۔
میں ہوں آپکی کنیزِ ازلی:۔ بنتِ عامر

لاہور

یکم اگست ۱۹۱۶ء

ہمشیرہ عزیزہ۔ اللہ خوش رکھے۔ تمہارا پُر لطف خط ملا۔ بڑے شوق سے
کئی دفعہ پڑھا ہر بار نیا ہی مزا پایا۔ بہن گھبراؤ نہیں میرے گوشۂ تنہائی پر تو جب کسی
طرف سے سنگ اندازی ہوتی ہے تو میں خدا کا شکر کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ پیوستہ
غنودگی اور خود فراموشی میں ایسے بیدار دانہ حملے مجھے میری زندگی کا یقین دلاتے
رہتے ہیں ورنہ میں تو کچھ عرصے سے اپنے تئیں مردہ تصور کر ہی چکا تھا۔ دوستوں کی
یاد میں تو مر چکا ہوں الحمد للہ دشمنوں کے لئے ابھی زندہ ہوں۔ آجکل تو جس قدر
حربے ہو رہے ہیں گویا میری اپنی خواہش فاعل کے دل میں مضمر ہو کر اسے آمادۂ پیکار
رکھتی ہے۔ خاموش سنتی جاؤ اور شکر ایزادی کرتی رہو ؎

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ۔۔۔ آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

اگر میں نے چاروں طرف اپنا "پیام" بھیجکر دشمن پیدا کر لئے ہیں تو اس کا مطلب
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میری تائید میں ایسے ہی وفا پرور دوست بھی عطا فرمائے گا ورنہ
پیاری بہن اس شخص کی بھی کوئی زندگی ہے جس کا دنیا میں نہ کوئی چاہنے والا ہو
نہ آزار پہنچانے والا۔ کسی ہندوستانی کو زبردستی اہل چین کے ایک خوشحال گروہ
میں چھوڑ دو جہاں نہ وہ کسی کی بات سمجھ سکے نہ اس کی زبان سے کوئی آشنا ہو
کسی کو اس سے محبت تو درکنار اظہارِ دشمنی کا موقعہ بھی نہ ملے۔ ہاں شب و روز
اس کی طرف کامل بے توجہی کا برتاؤ رکھا جاوے ایسی بے توجہی کہ جس میں نفرت
کی رمق بھی نہ ہو جس سے غریب الوطن کے دل میں اور کچھ نہیں تو غیرت کا جذبہ ہی مشتعل
ہو سکے۔ ایسی حالت میں وہ بیچارا ضرور خودکشی کرے گا پس مجھے جو ہمیشہ دنیا والوں
سے بے توجہی کی شکایت ہوا کرتی تھی جس کا رونا "حزن" میں رو چکا ہوں کم از کم

وہ تو رفع ہوئی - اب اتنا تو حوصلہ ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کے لئے اللہ تعالےٰ دوست بھی قوی ہی عطا کرے گا۔

دیکھو تمہیں اس امر کا رنج ہے کہ "پیامِ قیس" سے ناظرین مخزن میں بوجہ مضمون کی تہ کو نہ پہنچنے کے غلط فہمی پھیل گئی ہے - اور مجھے اس غلط فہمی پھیلنے سے جو خوشی حاصل ہوئی ہے وہ اصلِ مدعا کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ میں تمہاری سہیلی کنیزِ اسلام صاحبہ کا خط پڑھ کر خوب اچھلا کودا - اور کمرہ بند کر کے افریقی کافروں کی طرح ایک ساعت تک ناچتا رہا - تم حیران ہو گی یہ کیوں عزیزہ مجھے تو نیک متقی انسانوں کو جنہیں اپنے تقوے اور کمالِ زہد کے احساس کے ساتھ زعمِ علمیت بھی ہو فریب دینے میں خاص مزا آتا ہے - کیونکہ جب وہ اپنی انتہائے ریاضتِ نفس کے اعتماد پر اور کمالِ علم و فضیلت کے بھروسہ پر مجھ جیسے ناکارہ ہیچدان پُر معاصی انسان کے فریبِ سخن میں پھنس کر معلمِ اخلاق کا اہم مقصد اپنے ذمہ لینے پر آمادہ ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا مقامِ انبساط ہو سکتا ہے اور اس پر مزا یہ کہ سوت نہ کپاس جولاہے سے لٹھم لٹھا۔

اول تو جن لوگوں کا چلن "پیامِ قیس" [illegible] دکھلایا گیا ہے ان میں سے کچھ فرضی دوست ہیں کچھ دشمن پس حاجی جو شف [illegible] ان کی نمائشی عقیدت اسلام اور ظاہری تعصبِ مذہبی پر نکتہ چینی کی گئی تو میں نہیں سمجھتا کسی صحیح مسلک رکھنے والے مذہبی انسان کو ایسے کٹھ ملّا سے کیوں ہمدردی پیدا ہوئی [illegible] جو شف کی مختصر سی گفتگو میں یہ کیسے ظاہر ہوا کہ میں مذہبی وجدان سے بالکل بیگانہ ہوں۔

علیٰ ہذا القیاس چغتائی کی بے اصول بے حس [illegible] زندگی کا پہلو دکھلا کر نہایت دیانت سے بتایا گیا تھا کہ آجکل کے کالجوں [illegible] تعلیم [illegible] کے بے دل لوگ بھی کثرت سے موجود ہیں جن کا وجود [illegible] سے کم نہیں۔

ظریف کے نام پر اعتراض تو ان کے والدین سے ہوتا تو خوب تھا لیکن چونکہ بزرگوں کے فعل کا جوابدہ مجھے ہی ہونا پڑا ہے اس لئے عرض ہے کہ اکثر اوقات والدین بچوں کا نام بمنشائے الٰہی جیسا کہ بچے نے شہرت پیدا کرنی ہو رکھا کرتے ہیں مثلاً مجھے ہی دیکھو قبلہ نے قیس سے موسوم کیا اور میرے عارفِ حق دوست کا نام ان کے والدین نے مظہر الاسلام پسند کیا۔ الحمدللہ کہ اب تک تو ہم دونوں نے خصوصیات صفاتی کو قائم رکھا ہے اللہ آئندہ بھی توفیقِ استقامت بخشے۔ بھلا سوچو تو اگر میرا نام اباجان نیک فال سمجھ کر خوش اعتقادی سے صلاح الدین جُنید رکھ دیتے اور میرے دوست کا نام گلفام رکھا جاتا (کیونکہ ماں باپ کی نگاہ میں بچہ سے بڑھ کر اور کیا حسین چیز ہو سکتی ہے) تو ہم دونوں مجلس میں آتے کس قدر شرماتے۔ بخدا مَیں توسنِ شعور کو پہنچتے ہی پنجاب کی ارض پاک کی مناسبت سے اپنا نام رانجھا تجویز کرتا اور اپنے مرشد مظہر الاسلام صاحب کو صلاح دیتا کہ سُلھے شاہ کے جامۂ تقدس میں اپنے عقیدت مندوں کے حلقے میں جلوہ افروز ہُوا کریں۔ ہاں بھینا مجھے یہ حیرت ضرور ہے۔ کہ آپ کی سہیلی ظرافت اور مسخرا پن کو مترادف قرار دیتی ہیں اور حضرتِ ظریف جیسے معاملہ فہم کو جنہیں دنیاداروں کی کمزوریاں دیکھتے دیکھتے اور خدا فروشوں کی تعلیاں سنتے سنتے زہرہ خندہ ہونے کی عادت ہو گئی ہے۔ اپنے تدبر سے بھانڈ کا رُتبہ عطا فرماتی ہیں۔ اللہ اللہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ میں نے تو اپنے خیال میں جنابِ ظریف کو خوش فہم صحیح مذاق نکتہ رس انسان دوستوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ حاجی جوشف کے صنف کے آدمیوں کا دشمن ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان کے رگ وپے میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اسلئے سطحی نگاہ رکھنے والے ممکن ہے اُنہیں لا مذہب تصور کریں ورنہ وہ تو باوجود اپنے مُنہ سے وعظ فروش تجارت پیشہ علمائے امت سے نفرت

کا اظہار کرنے کے اپنے تئیں ایک سچی خادم اسلام جماعت سے بڑے استحکام سے وابستہ رکھنے کا اقرار کرتے ہیں۔ تمہاری سہیلی کے نکتۂ نگاہ سے بھی ظریف صاحب میں سوائے ظرافتِ خلقی کے اور کوئی اخلاقی سقم نظر نہیں آتا جس کی وجہ میں پہلے بتاچکا ہوں کہ ورزشِ ایمان نے اُنہیں لطائف شناسی سے محروم کر دیا ہے ورنہ جسے وہ نقص قرار دیتی ہیں وہی میرے خیال میں خوش اسلوب انسان کیلئے لازمۂ حیات ہے۔ رہا قیس و لیلیٰ کا معاملہ سو ہمشیرہ تم خود جانتی ہو لیلیٰ سے مراد شخص نہیں صنف ہے اور محض زندگی کا ایک ضروری پہلو روشنی میں لانے کی کوشش قصہ کے پیرائے میں کی گئی ہے۔ تمام مضمون کو ربط دینے کے لئے اور ایک مذاق نشاط پیدا کرنے کی غرض سے لیلیٰ موہوم کے نام فرضی خط لکھ مارا ہے ورنہ اصلی غائیت تو آجکل کے نوجوانوں کے طبائع کا رُجحان بتانے سے تھی اسی ضمن میں حُسن و عشق کی جھلک بھی پڑگئی تو ایسا کیا اندھیر ہوگیا جو کنیز اسلام صاحبہ نیچے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑگئیں میں تو قسمیں کھا رہا ہوں کہ لیلےٰ کوئی خاص وجود نہیں۔ بلکہ صنف لطیف کو حکایت کی رنگ آمیزی کے لئے لیلیٰ سے مشخص کیا ہے۔ دیکھو جہاں شعیب تو ام مرد و عورت کی رفاقت کا ذکر کرتے ہیں وہاں بھی قیس نے عورت کو لیلیٰ ہی سے یاد کیا ہے یہ فقرہ قابلِ غور ہے "کہ اے پروردگار اگر ابتدائے آفرینش میں تو نے لیلےٰ کی دعا اس کے لب کشا ہوتے ہی قبول فرمالی تھی" غرضیکہ تمام مضمون میں لیلیٰ سے مراد عورت لی گئی ہے اس پر بھی اگر کسی مومنہ کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے تو اللہ ہی رحم کرے میری تدبیر سے کیا ہو سکتا ہے ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر

میری نیک نیتی تو مسٹر ایڈم سن ایم اے کی دہریت پر اظہار تنفر سے ہی عیاں ہے

مگر جنابِ شعیب کی پند و نصائح فرض شناسی اور قیس کے فرضی چلن پر نکتہ چینی اور حضرت مظہر الاسلام کے مذہبی جوش کی تصریح میرے بیشمار گناہوں کے لئے کفارہ ہونا چاہیئے۔

عزیزہ تم نے بھی اپنے خط میں ایک نشتر چلایا ہے۔ سنو میرا قیام لاہور میں فقط شوق مطالعہ کی وجہ سے ہے چونکہ لاہور تمام پنجاب بلکہ ہندوستان بھر میں اپنی طرز کا تنہا دارالادب ہے اور یہاں متعدد کتب خانے بھی ارباب محنت کے لئے کھلے ہیں پس تعطیلوں کے زمانے میں ان کتب خانوں سے فائدہ حاصل کرنے کو یہاں پڑا ہوں یقین جانو لیلیٰ علم ہی مقصودِ حیات ہے اور اسی شوق نے مجھے یہاں ٹھہرایا ہؤا ہے ورنہ ہندوستان کی تیرہ خاک میں باعلم لیلیٰ کہاں میسر! دیکھو تم میرے متعلق کمبخت لیلیٰ سے وابستگی کا خیال وسوسۂ شیطانی سمجھ کر نکال ڈالو روایات سے ثابت ہے کہ جنابِ شیطان الرجیم بھی بعض اوقات خاصانِ خدا کو گمراہ کرنیکے زعم میں باطل الہام کر دیا کرتے ہیں۔ یہ سلیقہ تو تمہیں خود ہونا چاہیئے کہ الہام شیطانی اور القاے رحمانی میں تمیز کر سکو۔

مجھے تمہارے ایک جملے سے قطعی اتفاق نہیں سو واقعی مذہب غذائے حیات ہی ہونا چاہیئے کیونکہ اگر محض دواے امراض ہوگا تو مریض تندرست ہونیکے بعد پھر بھی بیمار پڑ سکتا ہے لیکن اگر مذہبی جذبہ غذاے روحانی بن کر جزو بدن ہو جائے۔ تو کوئی اخلاقی مرض لاحق ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ البتہ یوں کہو کہ ہر قسم کی غذا کی طرح غذائے مذہبی میں بھی اعتدال لازم ہے جس سے سوئے ہضمی کی شکایت مذہبی زندگی کی قطع و برید کا باعث نہ ہو۔ اللہ تعالے تمہارا حافظ و ناصر ہو۔

تمہارا خیر اندیش بھائی

جہنم سے ایک خط

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

بھائی انعام میری قیدِ حیات کے زمانے میں آپکی جانب سے پرسشِ احوال وغیر معمولی رقتِ قلب اور ابلتا ہوا جوشِ ہمدردی جسے بعد کے واقعات نے جامۂ تصنع سے عریاں کر کے مایوسی خیز رنگوں میں ظاہر کر دیا تھا۔ مجھے دنیا و مافیہا کی لگاوٹوں سے مستغنی کرنے کو بہت کافی تھا جس وقت ہر طرف سے ادبار و نحوست کی گھٹا مجھے اپنے اندر چھپا لیتی تھی اور کسی جانب سے شعاعِ امید مجھ پر نہ پڑ سکتی تھی۔ خیال میں بھی مرقعِ عشرت نہ کھینچ سکتا تھا تو اس وقت فقط آپکی دلنواز نگاہِ الفت سے مقابلہ مصائب کی ہمت پیدا ہوتی تھی۔ آہ مجھے خوب یاد ہے کہ میری موت جو یوں تو غریب الوطنی کیوجہ سے بھی ہی دردانگیز آپکی بے توجہی سے میرے مسافر نواز ہمسایوں کے لئے خاص طور پر عبرتناک ہوئی تھی۔ قدرت نے حساب اوسط قائم رکھنے کو مجھ جیسے مجلسی آدمی کے لئے اوائل کی افراطِ عشرت کو آخر عمر کی کس مپرسی سے بدل دیا تھا۔ گویا کہ مسئلہ تناسخ مجھ پر باوجود عقیدتاً مسلمان ہونے کے خوب عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ ہزار کوشش کروں۔ آغازِ عمر اور خاتمۂ حیات کی اپنی ہی دونوں شخصیتوں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق پاتا ہوں۔ شروع کی فراوانیٔ عیش اور ناعاقبت اندیشی کی روش کا خمیازہ آخر میں ایسا بھگتنا پڑا کہ اپنی ہی ابتدا اور انتہا سے دو مختلف انسانی زندگیاں زمانے کے سامنے پیش کر دیں۔ ابتدا تو ایسی حیات بخش کہ جدھر نگاہ اٹھائی تسکینِ قلب کے لئے ہجوم احباب ہی نظر آیا۔ احباب بھی ایسے کہ جن کی ظاہری روش استقامتِ جاوید کی ضامن ہوا کرتی تھی لیکن انجام

کو ہی دوست کچھ تو اپنی مصائب و آلام کی وجہ سے کنارہ کشی پر مجبور تھے۔ کچھ موت کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ کچھ زمانے کی ستم ظریفی سے بُعدِ مسافت میں پنہاں ہو گئے۔ فقط ایک آپ کا دم اور نگھتے کو ٹھیلتے کا سہارا باقی تھا۔ سو آپ بھی واللہ عالم مرنے والے کے ساتھ ایک قلیل عرصے تک کے لئے اپنی جبلّی منافقت اور نمائشی اظہار الفت کو کیوں پہلے کی طرح قائم نہ رکھ سکے۔ آہ۔ اگر آپ کا جاں گسل دستِ تغافل مجھ نیم جاں پر ایسا کاری نہ پڑتا۔ تو شاید ابھی میں چند روز اور قید حیات کی سختیوں کو برداشت کئے جاتا۔ کاش آپ قدرے مروت کو کام میں لاکر میرے مرنے تک اپنی ابتدا کی منافقانہ طرز دوستی کو نبھائے جاتے اور مجھے اس پُر لطف فریب محبت ہی میں دم توڑنے دیتے۔ تو کم از کم آپکی وفا فروشی کا آخری جان کاہ صدمہ تو مجھے برداشت نہ کرنا پڑتا۔ حالت نزع میں آنکھیں آپکو تلاش کرتی تھیں میرے پتھرائے ہوئے ڈیلے اگرچہ حرکت نہ کر سکتے تھے لیکن جسقدر چہرے مجھے سامنے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر گو نہ ترحم برس رہا تھا لیکن مجھے ان میں سے ایک بھی شناسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جو پس مردن میری لاش کو ایک پُر رقت آنسو یعنی محبت کی آبشار رواں کے ایک قطرہ سے پُر نم کر دے ؛

اُف نگاہیں آپکی جستجو میں تھک گئیں اور آنکھوں تلے اندھیرا سا آنے لگا۔ وہ ہمدرد ناآشنا چہرے بھی بادلوں میں چھپتے ہوئے معلوم ہوتے تھے کہ یکایک مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ جانتے ہو وہ غشی کیا تھی ؂

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

آنِ واحد میں مجھے ان فرشتہ سیرت تیمارداروں کے حلقہ سے کھینچ کر اس مقام معروف پر پہنچا دیا گیا۔ اگر غیر معمولی قوت حافظہ میری مددگار نہ ہوتی۔ تو یہاں کی

صعوبتیں تمام ماضی کے سوانح بھلا دینے کے لئے کافی تھیں۔ آب عذاب کے فرشتے اپنی تمام تر تدابیر مجھے تنگ کرنے کے لئے عمل میں لاتے ہیں لیکن جو دل کہ عشق آفرین فسانوں سے گرمایا جا چکا ہو اُس پر دوزخ کے ناممکن البیان آتشین آلہ ہائے عقوبت بھی اپنی وضعی عمل میں بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ آپ نے تو اس عالم ملایک فریب میں جسکو میں حیاتِ جذبات کے زمانہ میں دنیا سے موسوم کیا کرتا تھا۔ میرے جہنم واصل ہونے کے بعد نئے نئے فراموش کن اشغال پیدا کر لئے ہونگے لیکن میں تو اُس آماجگاہِ قلبی سے بُعدِ واہمہ کے باوجود ابھی تک ارمان ہائے نادیدہ کی یادیں۔ اِس مقامِ عذاب کی جاں سوز تپش کو اپنے لئے بے اثر پاتا ہوں ؛

مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنی مختصر سی ارضی زندگی میں نہایت استقلال کے ساتھ لیلئے مقصود کے معصیت سوز پاک تصور میں تزکیہ نفس کے مقررہ مراحل طے کرنے کا آرزومند ہوا کرتا تھا۔ ہاں انعام شاید اِس بیان سے آپکو خودستائی کی بو آئے اسلئے آپکی شرح صدر کی غرض سے لکھتا ہوں کہ وہ تمام ریاضت نفس اسلئے نہ تھی (جیسے کہ اِس خط کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہوگا) کہ ہنگام آخرت میں قاضی الحاجات سے جنت الفردوس کے کسی طبقہ میں اپنے لئے عشرت دوام کی دستاویز حاصل کروں کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے اس سکتہ آگین سکونِ مطلق کو جو کہ دنیا کے چند سالہ مجاہدہ کے بعد ابدالآباد تک کے لئے صالح انسانوں کو حاصل ہوگا۔ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہوں۔ میرا جب بھی یہی خیال تھا کہ مشقت سے خوگر گروہِ مجاہدین کیلئے بہشت کی نامنقطع یکساں راحت ناموافق ہوگی۔ ایسے پیوستہ سکون سے حرکتِ اعصاب رُک جائیگی۔ خون کی انجمادی حالت عملِ دوران کو بند کر دیگی جس سے اگر اور کچھ نہ ہو تو مرض رعشہ بدن کو اور مرضِ تساہل اخلاق کو ضرور لاحق ہو جائیگا پس ایسی بہشت سے تو میرا دوزخ ہی اچھا ہے کہ یہاں دنیا کی طرح جد و جہد نالہ و زاری

توبہ و استغفار جاری رہتی ہے۔ دنیاوی عشرتِ حسرت ناکی یاد۔ ارحم الراحمین کے عفو کی امید اور ایک اضطرارِ مستمرہ ہم سرا یا فتوں کو سستی کی لعنت سے محفوظ رکھتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سنئیے میں آپکی اور اپنی روشِ جذبات کا مقابلہ کرنے والا تھا میرے ثباتِ محبت کے برخلاف آپ ہماری دولت قلبیہ میں ہری چگ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جذبۂ محبت کو نعمت تو ہم دونوں ہی سمجھتے تھے لیکن آپکا ہوسناک دِل پابندِ استقامت ہونے سے متنفر تھا۔ آپ کا سفرۂ محبت الوان نعیم سے چنا جاتا تھا اور میرے مذاق کی چاشنی کے لئے ایک وقت میں فقط ایک تبرک منجانب اللہ کافی ہوا کرتا تھا اور اِس یگانہ نعمت الٰہی کی مجھے اتنی قدر ہوا کرتی تھی کہ آپ اپنے ہمہ گیر مذاقِ عشق سے مجبور ہو کر میری وفا کیشی پر منہ چڑایا کرتے تھے۔ آپکی الفت پاشیاں محض مرگ اور سوہان روح سے محفوظ رہنے کے لئے ہوا کرتی تھیں اور آپ ہمیشہ اپنے قلبی تعلقات کی مدد سے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے بقدر ہمت غذائے انبساط حاصل کرتے رہتے تھے۔ برخلاف اِسکے میں دنیا کی خود غرضانہ روش سے بیزار ہو کر کسی ایک مزکی و مطاہر وجود کی جستجو میں رہتا تھا۔ جو مجھے روزمرہ کے مادی افکار سے بے حس کر کے ملاءِ اعلیٰ کی جانب لے اُڑے۔ آپ اپنے مطمع نظر کو ایک عامیانہ ابن الدہر کی طرح "معشوق" کی فرسودہ اصطلاح سے یاد کیا کرتے تھے لیکن میرا لاعلاج جنون مجھے استغراق کے انتہائی مقام پر پہنچا کر اُسے اکثر اوقات بہن بھائی کے محبت آشنا نام سے بلکہ ماں باپ کی شفقت خصوصی کے خطاب سے یا اِس سے بھی بڑھکر پیر و مرشد کے جامۂ تقدس میں میری چشم بصیرت پر ظاہر کیا کرتا تھا۔ ظاہرا یہ تمام رشتے نفس انسانی کے خود وضع کردہ ہیں جو کہ اربابِ فنا کے تعلقات میں محض خونی امتیاز

سے بلند ہو کر خالص صفاتی نام رہ جاتے ہیں۔ جن کا اطلاق میرے دِل و گردہ کے لوگ افراطِ شوق میں بے محابہ کسی مختص وجود محمود پر کرنے سے نہیں جھجکتے کیونکہ ہم لوگ تمام دُنیا سے قطع تعلق کر کے فقط اسی تن واحد میں وہ تمام مہر و محبت بزرگی و تقدس کے جلوے دیکھا کرتے ہیں۔ جو کہ ایک سفلی انسان اپنے عزیزوں والدین یا پیر طریقت میں محسوس کرتا ہو گا محبت جب عامیانہ حد نگاہ سے بلند ہو جائے تو چاہنے والے کی وسعت قلب پر اسکی لطیف چشم تخیل میں محبوب شخصتیں اپنی انفرادی حیثیت کھو کر برادرانہ مہر پدرانہ شفقت اور عارفانہ ہدایت کا سرچشمہ بن جایا کرتی ہیں۔

سنئے آپکی منتہائے آرزو اپنے معشوق سے ایک مختصر سی صحبت ہوا کرتی تھی لیکن مجھے مقاربتِ صوری کبھی باعث تسکین نہیں ہوئی میں اس سے بھی بلند ہو چکا تھا۔ البتہ میں ہر وقت آرزو مند ہوتا تھا کہ ٹیلیپتھیک اثر (جذب انسانی) کے ماتحت اسکو بھی میری طرح احساس وفا ہو۔ وہ بھی اپنی تنہا ساعتوں میں ایک تخیل پیدا کیا کرے اور پھر اسکی تکمیل کے لئے میری طرح تڑپے لرزے اور اپنے تئیں وقف ارمان کر دے آہ جن اوقات میں میں اس سے ملا کرتا تھا تو مجھے ساتھ ہی اسکی رخصت کے بعد ساعت قریبہ کی فقدانِ عشرت کا تصور اسکی موجودگی میں بھی کانٹوں پر رکھتا تھا۔

ہے وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا لگا ہوا

ہوں آپ اپنے فہم رسا سے عذاب میں

وہ روح فرسا ہنگامے میرے ذہن میں ابھی تک نقش ہیں جن کی حقیقت سے آشنا ہونکی آپ میں اہلیت ہی نہ تھی سب سے مجھے یاد ہے کہ اُس سے ملاقات کے دوران میں ایک غیر مادی نہایت ہی لطیف شے میرے دھڑکتے ہوئے دِل سے اٹھ کر مسلسل آنکھوں کے راستے خارج ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک حیات بخش جذبہ تھا۔ جو مجھے بے جان کر کے اُسکے گرد کرۂ نور کا ایک ہالا بن جاتا تھا اور اسکی دردنیز

رخصت کے بعد میں اپنے تئیں مذبوحی حالت میں نہایت ہی نڈھال سکراتِ موت کے
عالم میں پاتا تھا۔ اُف اس دارالکرب میں بھی اِس وجدانی کیفیت کے تصور سے
میرا بدن کانپنے لگتا ہے۔ حدتِ شوق سے دل لرزنے لگتا ہے خون میں ایک تلاطم
برپا ہو کر نبضیں اچھلنے لگتی ہیں ؎

سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت
درد کی غمگساریاں نہ گئیں

میں فطرتاً یاس آشنا (pessimiat) واقع ہوا تھا۔ آپ تو ہمیشہ زمانہ حال
میں گھرے رہتے تھے لیکن میری نگاہِ بھیانک مستقبل پر لگی رہتی تھی۔ میری وہ مختصر
سی زندگی بوجہ ذکی الحس اور تخیل آشنا ہونے کے مجھے ہمیشہ وہمی امراض میں مبتلا
رکھتی تھی۔ البتہ ایسی از خود رفتگی کے عالم میں ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ
میں دعاؤں پر زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔ اور اجابت کے یقین کے ساتھ مصروف
زاری رہا کرتا تھا۔ قربِ الٰہی کا آرزومند ہوا کرتا تھا۔ دنیا والوں سے دل میں نفرت پیدا
ہو گئی تھی اور چونکہ یہ تمام ریاضتِ نفس میں اسی کی فیض صحبت کا نتیجہ سمجھتا تھا اسلئے
اسے اپنے ذہن میں عارف باللہ قرار دیکر اپنے تئیں اسکے حلقہ خدام میں داخل کرنے کے
جنون میں حصول تقوائے میں مبالغہ کیا کرتا تھا۔ ورنہ جس منحوس زمانے میں کہ میری
مینائے دِل شرابِ محبت سے خالی ہوتی تھی۔ میرا مذہبی وجدان بھی سرد پڑ جاتا تھا۔
آپکو حیرت ہوگی کہ باوجود الٰہی خوشنودی کی اِس قدر تمنا رکھتے ہوئے مجھے دوزخ
کا ایندھن کیوں بنایا گیا۔ سنئے اگرچہ منزلِ مقصود صحیح تھی لیکن میں نے صراط مستقیم کو
چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں سے وہاں تک پہنچنا چاہا تھا۔ اور جن جان جوکھوں کے
راستوں میں میں پڑا تھا۔ وہاں قدم قدم پر بدعت و شرک سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا
مجھے یہاں لا کر بتایا گیا ہے کہ گو تمہارا قیام اِس جگہ عارضی ہوگا۔ لیکن یہ اِس

جنون کی پاداش میں ہے کہ تم دنیا میں فانی وجودوں کیساتھ تعلق قلبی قائم کرکے وہ تحفۂ نیاز جو سوائے بارگاہ رب سرمد کے اور کہیں سزاوار نہیں منجانب اللہ فرستادہ ہستیوں کے حضور پیش کرتے رہے ہو۔خیر میری نیت تو گناہ کی نہ تھی۔ اگرچہ مجھے غلو کا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ دُعا کرو کہ عالم برزخ کی مشکلات مجھ پر آسان ہوں +

آپکو یاد ہوگا کہ دورانِ حیات میں ہندوستان کے طریق عقد سے بیزار ہوکر ہم نے ایک کنوار سبھا قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا۔کہ چونکہ ہندوستان کا موجودہ تمدن تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیئے انکی دماغی یا اخلاقی رفیقہ مہیا نہیں کرسکتا اور عالم و جاہل کی دائمی رفاقت یوں بھی ناممکن ہے۔پس جب تک ہمارے شرکا کو انکی مذاق کی بیوی دستیاب نہ ہو مجرد رہنے کی قسم کھائیں الحمدللہ کہ میں تو مرتے دم تک اپنے حلف پر قائم رہا۔ آپکی سیماب وار فطرت سے ڈر لگتا ہے۔ کہ کہیں میرے پس مرگ آپنے پیمان تجرد نہ توڑ دیا ہو۔ دیکھئے اگرچہ میں آپکے لئے مر چکا ہوں لیکن ہم وفا کو موت نہیں آنی چاہئے پس آپکو متنبہ کیا جاتا ہے کہ کسی حور صحرائی سے تعلق سفلی ہرگز ہرگز پیدا نہ کرنا خواہ علمائے امت آپکے کتنے ہی درپے آزار کیوں نہ ہوں۔ ورنہ میری روح آپکی پیمان شکنی سے جہنم میں اور زیادہ سوختہ ہوگی۔یہاں کی کیفیت کرب، تو پھر کبھی لکھونگا البتہ ایک دوست کا حال آپکو سناتا ہوں۔ کیونکہ یہاں آپکے دلنواز فسانۂ حیات بیان کرکے انہیں بھی آپکا بہت مشتاق بنا لیا ہے اگرچہ حسنِ صورت قدرت نے انہیں عطا کرنے میں خاصا بخل کیا ہے۔ لیکن ماشاءاللہ سیرت ایسی تھی کہ انہیں دوزخ میں بھیجا جاتا۔ لیکن اللہ کے اسراروں میں ہم تم دخل دینے والے کون۔ انکے زادبوم کا شرف افریقہ کے علاقہ سینی گیمبیا کو حاصل ہے۔ اِس ملک میں جہالت کا عام دور دورہ ہے عورتیں تو یکطرف مرد بھی الف کے نام بے نہیں جانتے۔ لباس عریانی ہے۔ سنگھار کی غرض سے ایک بڑا سا آبنوسی بلاق ناک میں آویزاں

رہتا ہے وہ قیام افریقہ کے زمانے میں اِس علاقہ کے گورنر کے ہاں نرس تھیں۔
اِس عرصے میں انہوں نے انگلش فرنچ اور عربی زبانیں سیکھ لی تھیں۔ اس کا نتیجہ
یہ تھا کہ اپنی جاہل قوم میں انہیں نکاح سے تنفر ہوگیا تھا۔ گورنر مع انکے ہندستان
کی سیر کو آ رہے تھے۔ راستہ میں تپ محرقہ سے نرس کا انتقال ہوگیا اور وہ فقہ اعین
میں جہنم میں پہنچا دی گئیں۔ چونکہ وہ بہت عالمہ ہیں۔ لہذا یہاں بھی ملایک فریبیوں
سے باز نہیں ہتیں۔ اور اپنی لحن میں گا گا کر گروہ ملایکہ کو اپنا ثنا خواں بنا لیا ہے
مجھ پر خاص طور پر مہرباں ہیں حبشی نژاد ہونے کی وجہ سے بہت جفاکش ہیں
اسلئے اکثر اوقات میری مشقت معینہ بھی وہ خود ہی پوری کر لیا کرتی ہیں۔ وہ آپکی اسقدر
مشتاق ہوگئی ہیں۔ کہ فرشتوں کی منت سماجت کر کے چند سالہ دنیاوی قیام کی
اجازت لے لی ہے۔ اور عنقریب مجھ سے رخصت ہو کر وہ دنیا میں آیا چاہتی ہیں۔
آپکو تلاش کر کے ضرور ملینگی۔ ان سے میرے تمام حالات آپکو معلوم ہو جائینگے۔ ہاں
میں آپکو احتیاطاً متبنہ کرتا ہوں کہ اُن سے محض مغربی دوستی جہاں تک ہو سکے قایم کرنے
کی کوشش کرنا لیکن خدا کیلئے انکے حسن سیرت سے متاثر ہو کر کہیں پیمان تجرد نہ توڑ دینا نہیں تو
وہ اپنی میعاد آزادی ختم ہونے پر آپ کو بھی اپنے ہمراہ جہنم میں لے آویں گی۔ اوّل تو شادی
کے بعد دنیا ہی آپکے لئے جہنم ہو جائے گی۔ تعارف کے لئے حلیہ عرض ہے۔
چار فٹ اونچا قد۔ ڈھائی گز گھیر۔ سیاہ فام رنگ جو تمازتِ آفتاب سے چمکنے لگتا
ہے۔ تنگ پیشانی۔ پیل چشم۔ چپٹی ناک۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ جن پر مسی کے
بجائے گہرا نیل کا رنگ تھپا ہؤا ہے۔ سامنے کے دو دانت باہر نکلے ہوئے
بڑے بڑے کان اور گردن کی رگیں غیر معمولی پھولی ہوئی ہیں۔ بزم دوزخ میں
مس شبلکبا کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ بس اللہ ہی آپ کا حافظ و ناصر ہو۔

دعاگو۔ قیس از جہنم

بنام قیس

پیارے قیس مجھے ندامت سے اعتراف کرنا ہے اپنی کوتاہ قلمی کا۔ غالباً اس ندامت سے آپ کے ادراک میں یہ بات تو القانہ ہوگی کہ یہ کوتاہ قلمی بلاوجہ ہے۔ اس کے لئے وجوہات ہیں آیات ہیں اور آیات بھی بینات ہیں ان وجوہات کو قلم کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے اس سمع خراشی سے آپ اس قدر جزبز تو نہ ہوں گے۔ کہ جامے سے باہر ہو جائیں۔ لہذا سمع خراشی کی معافی مانگ کر اور جسارت کی اجازت طلب کرکے تمام و کمال عرض کئے دیتا ہوں۔

اول۔ کلام الہامی کا نہ تو کوئی جواب ہوا اور نہ ہوگا۔ یہ کلام پاک ہمیشہ سے کانوں کو محفوظ آنکھوں کو متلذذ اور دل کو متاثر کرتا رہا ہے لیکن جہاں اس الہامی زبان میں یہ سرور انگیز کیفیات موجزن ہیں۔ وہاں یہ بات بھی موجود ہے کہ اہل زمین کا قافیہ تنگ کئے دیتی ہے۔

دوم۔ ان انکشافات کی بنا پر جو اپنی زلیست کے مولوں خرید کئے ہیں اور اسقدر گراں خرید ہونے کے باعث ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں۔ برداشت نہیں کرسکتا۔ کہ آپ کے قیمتی وقت کا کوئی حصہ اپنی ہوا وہوس پر صرف ہونے دوں بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس متاع بے بہا کا بیشتر حصہ پہلے ہی ڈاکوؤں رہزنوں کی دستبرد کی نذر ہو چکا ہو۔ مجھے جس وقت اپنی خودکشی کا جو تصنیع اوقات کی شکل میں وقوع پذیر ہوئی خیال آتا ہے اور یہ غلط نگر نگاہ اپنے بھیانک مستقبل پہ پڑتی ہے۔ تو پسینے پر پسینے آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ رات کو سوتے وقت یہ خیال آجائے۔ تو نیند حرام۔ صبح کو اسکا ہولناک نقشہ کھچ جائے

تو خورو نوش ترک ؎

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ میگساراں
زہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں

خدارا میری حالت پر نظر کرو۔ اور اس سے عبرت حاصل کرو۔ اے کاش میری عبرت آموز زندگی آپ کو چونکا دینے کا ذریعہ بنے۔

یہ ہیں وجوہات جو ترسیل جواب میں مانع آتی ہیں میری بدنصیبیوں کی طول طویل فہرست میں ایک نمایاں اور جانگزا اضافہ ہوگا۔ اگر آپ اس عرضداشت کو میرے خلوص میری ارادت وعقیدت کی کمی پر محمول کریں گے ؎

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے

بھائی جان میں بہت نالائق ہوں جہاں مجھے تعلق خاص ہوتا ہے وہاں وفور کیفیات کے باعث میری زباں گنگ ہو جاتی ہے لوگ کہتے ہیں۔ کمزور طبیعتیں تعلقات قلبی کے شعلہ پوش جذبات کی تاب نہ لاکر ساکن ہونے پر مجبور ہو جاتی ہیں ہماری کمزوری ذرا ملاحظہ ہو کہ تعلقات قلبی تو ہوش رہا سہی۔ یہاں تو احباب کی حوصلہ افزا پرسشوں کے لئے بھی تاب مقاومت نہیں۔ تم تو اُن برگزیدہ ہستیوں سے ایک ہو جن کے ساتھ بقول اہل عشق ازل میں میری روح آشنا ہو چکی ہے۔ بہرحال میرا مدعا اس تمام سمع خراشی سے صرف اسقدر تھا۔ کہ جو وقت دستیاب ہو سکے اسکو غنیمت شمار کرنا چاہیئے اور بازئ عبث کی نذر ہونے سے محفوظ رکھنا چاہیئے ؎

ہر فرصتے کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست

ہاں اگر طبیعت ان مضیع الوقت اشغال کی ایسی ہی عادی ہو گئی ہو تو تقدیم و تاخیر کو مدنظر رکھ لیں یعنی اوّل کالج کے لئے وقت لیکن اس سے ایک لحظہ کم نہ ہو جس قدر درکار ہے۔ دوم شغف قلبی۔ سوم احباب۔ چہارم اگر وقت باقی ہو۔ تو میرے جیسے بے مصرف آدمی ہیں سننا چاہتا ہوں کہ یہ پروگرام آپ کو کہاں تک پسند ہے۔ خدا کے لئے جواب میں غالب کا یہ شعر نہ پڑھ دینا ؂

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اب آپ کے صحیفۂ گرامی کا جواب عرض ہے۔ اللہ اللہ مرورِ ایام نے آپکو یہاں تک تہیدست کر دیا کہ ہم نیازمندوں کی خدمات کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ جیسا صاحب نظر صحیفۂ قدرت کو چشم بینا سے مطالع کرنے والا اس بھرے میلے کا تماشا کرے۔ اور خالی دامان ہو بھائی ہمیں تو باور نہیں آتا اور خدا نہ کرے خدا نہ کرے ایسی ہی حالت ہے تو پھر "ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانہ"

یہ مزرع آخرت لعبت کدہ پندار کے مجسموں سے اٹا پڑا ہے اس ربع مسکون میں ایک گوشہ بھی تو ایسا نہیں جہاں یہ مظاہر آلہیہ جلوہ فرما نہ ہوں اس صانع حقیقی کا فضل یوں تو عام ہے اور بلا امتیازِ ملت و مشرب بارش کناں۔ لیکن دولت قلبیہ کے حلقہ بگوشوں پر تو فضل باری کی حد ہی ہو گئی ؂

دنیا میں پریزاد دیئے خلد میں حوریں
بندوں سے وہ اپنے کبھی غافل نہیں ہوتا

آپکو تو "مرگ جذبات" کے باعث قبر میں پہلی رات ہے اس نیازکیش نے اپنی کور بصری کے صدقے میں کئی سال ایک تنگ و تاریک گوشۂ قبر میں گذار دیئے

آپکو تو اپنی دلفریب زیست کے ہنگامے ایک ایک کرکے یاد ہیں بندہ انکی یاد سے بھی فراغت پاچکا تھا کہ یکایک رحمت پروردگار کو حرکت ہوئی۔ اور فضل ربی جوش میں آیا۔ ایک ہنگامہ زا ہستی جسکو صانع قدرت نے نور کو شہاب میں گوندھ کر بنایا تھا جسکی نگاہِ فتنہ زا کا ایک گوشہ تمام متاع صبر کو تہس نہس کردینے کو کافی تھا۔ جسکے زیر لب مسکراہٹ پارے کی طرح ٹوٹتی تھی جسکا تبسم بوقت ہمکلامی چمن بھر زعفران متکلم پر برسا دیتا تھا حشر خرامی کرتی ہوئی آن کی آن میں بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے کوندگئی اور دل و جگر کو مرتعش کرتی گئی ؎

چہرۂ یار سے نقاب اُٹھا
دل سے اک شورِ اضطراب اُٹھا

بھائی جان کیا عرض کروں وہ جنس گرامی کیا ہے۔ جن لوگوں کی پیشانیوں پر خدا نے آنکھوں کی بجائے دو ٹھیکریاں نہیں باندھ دیں۔ اور جن کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہوئی ہے۔ وہ اس مقدس ذات میں اس ملکوتی الشان انسان میں اس حجلہ نور میں وہ کچھ دیکھتے ہیں۔ جو موسے نے طور پر خدا نے حضرت محمد صلعم میں اور قیس نے خاک نجد میں دیکھا تھا ؎

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

آہ کل بڑی ہمت کرکے میں اس سے ملنے گیا اور ایک ذوق اور وجدان سے اسکی طرف بڑھنے کو تھا۔ کہ اسکی تغافل شعار نگاہ نے جس سے پایا جاتا تھا کہ اگر میری ملاقات سے ناراض نہ ہوگا۔ تو ناخوش تو ضرور ہوگا۔ مجھے وہیں روک دیا۔ ؎

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانہ

بہرحال کل کی بدقسمت ملاقات نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ محبت ایک خاص حد تک (جس حد تک وہ شخص جس سے محبت کی جائے برداشت کر سکے) خوشگوار رہتی ہے جونہی یہ ان حدود سے گذری یہ دونوں کیلئے رنج اور بدمزگی کا موجب ہو جاتی ہے۔ ان حدود کا اول تو اندازہ کرنا ہی بڑی مشکل بات ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح صحیح اندازہ ہو بھی جائے۔ تو اس شخص کے لئے جسکے دل میں محبت آگ کی طرح بھڑک اٹھی ہو ان حدود کا ملحوظ رکھنا ایک امر محال عربی میں ایک مثل ہے کہ کسی[1] چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ اندھا تو فی الواقع ہو چکا ہوں۔ کیونکہ وہ حدود مجھے نظر نہیں آتیں۔ ہاں ابھی بہرہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ان حدود کے متعلق سننے کی ہنوز تمنا ہے۔ لہذا میں نے اسکے تصفیہ کا ایک طریق سوچا ہے اور وہ یہ کہ اسی ستم کیش سے التجا کروں کہ آپ مجھے صاف صاف بتا دیں۔ کہ کس کس حد تک آپ میری محبت کو برداشت کر سکتے ہیں میری کون کونسی باتیں ہیں جو آپ کو دق کیا کرتی ہیں یہ آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔ آپ اسکو ادا کر دیں آگے محبت نے مجھے بہرا بھی بنا دیا ہوگا تو خود اسکی سزا بھگتوں گا ؎

مرے پاس وفا کی کاشش تم مقدا ٹھہرا لو
کہ اتنا مجھ سے ہو سکتا ہے اتنا ہو نہیں سکتا

لیکن آہ شوخیٔ درخواست کہاں سے لاؤں پیارے قیس بھلا آپکا اور میرا مقابلہ کیا میری حدتِ جذبات کو تو پہلا یاس خیز معاملہ ہی سرد کر دینے کیلئے

---

[1] حبک الشیٔ یعمی و یصم۔

کافی ہے آپ استقامتِ جاوید کے دعویدار ہیں۔ یہاں دشمنانِ وفا استوریٔ حال کی توفیق بھی نہیں بخشتے۔ بھائی سنو جس مقام محمود کے آپ خواب دیکھ رہے ہیں وہ ما و شما کے مطمحِ نظر سے بدرجہا بلند اور بمدارج بالا ہے۔ ہم کو کیا معلوم عاشق معشوق میں سما جاتا ہے یا معشوق عاشق میں ضم ہو جاتا ہے یہ آپ کے کام ہیں آپ ہی جانیں۔ اپنی زیست کا سامان تو کیفیات کی مختصر سے مختصر تعداد پر تمام ہو جاتا ہے جن میں سے ایک استمراری ہے اور دوسری اضطراری استمراری کیفیت تو عبارت ہے احباب کی محبّت سے۔ کتنے احباب؟ چند ایک جن کے شمار کو ایک اُنگلی کے پورو سے کافی ہیں۔ اور ان احباب میں شاید ایک بھی تو ایسا نہیں جو ہمارے مہر لبِ جذبہ محبّت کا کما حقہٗ اندازہ کرنے پر قدرت رکھتا ہو یہ کیفیت متاعِ حیات ہے اور وابستہ دامنِ زیست۔

دوسرا جذبہ ہے اضطراری جو مشتق ہوتا ہے کسی شہابِ ثاقب سے جیسے کہ اوپر بیان کر آیا ہوں۔ ہم خاک نشینوں کو ان اجرامِ فلکیہ سے ہیچو شما ساکنین ملأ اعلٰے کی طرح کسی قیامگاہ کسی مجلس یا صحبت میں لذت اندوز ہونیکا تو موقعہ نہیں ملتا۔ البتہ ایسا اکثر وقوع میں آتا ہے کہ کبھی کوئی سرِ راہ نازل ہو کر جذبات کو دیا سلائی دکھاتا گیا۔ کبھی کوئی کسی رہنے میں فروکش ہوا۔ تو وادیٔ سینا کا نقشہ کھینچتا گیا۔ برعکس پہلے جذبہ کے جو نہایت استقلال سے ایک سکون آمیز روش پر چلا جاتا ہے۔ یہ جذبہ حدت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا جب کبھی کسی کوچہ کی گردش پر یا کسی چوراہے کے اتصال پر اچانک کسی کی چہرہ کشائی کے تصدق میں مشتعل ہو جاتا ہے اس وقت تو یہ جذبہ نہیں ہوتا۔ ایک لولہ بن جاتا ہے۔ فلک سے بجلی بن کر گرتا ہے۔ دل سے دھواں بنکر اُٹھتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے پردہ بنکر تن جاتا ہے۔ میرے جیسے گنگ زبان کو

تو بھلا یارائے سخن کہاں انعام کی زبان ہے جو اس عالم ہو میں بھی کتر بیونت سے باز نہیں رہتی۔ اور بے اختیار منہ پیٹ کر بال نوچ کر بے محابہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اگر دوبارہ رب الاصنام نے ہمیں بایں ہیت کذائی جس سے من حیث القوم تمام صنم "دور باش" کہنے پر مجبور ہوتے ہیں دنیا میں بھیجا تو میں کبھی نہ آؤنگا"

پیارے قیس یہ ہے کل پونجی جس پر اپنی حیات کا دارو مدار ہے۔ آپکی ملائک فریبیاں آپ کو مبارک ہیں۔ ہمیں تو منزل حیات کو طے کرنے کیلئے صرف اسی قدر درکار ہے۔ ہاں فکر ہے تو اس بات کا کہ کہیں سلسلہ حیات کی قطع و برید سے قبل مینائے دل اس مے سے خالی نہ ہو جائے ؎

عجب عذاب میں ہے جانِ میکشاں ساقی
نہیں شراب تو ذکرِ شراب رہنے دے

نیاز آگین
ابنِ آزر

فریبِ آرزو

بلاغت اللہ فطرتاً مجلسی واقع ہوا تھا اور یہ خوبی قدرت نے اسے بخشی تھی کہ ہر بزم میں یارانِ حاضر کے رجحانِ طبع کو تاڑ کر انداز تکلم کو دلفریب بنا سکتا تھا۔ اس کا ہمہ گیر دماغ کبھی کسی مسئلہ کو سمجھنے سے عاجز نہیں ہوا۔ مجمع اضداد میں ہر شخص اُسے اپنا ہم مذاق تصور کرتا تھا۔ اِسکی نکتہ رس طبیعت عقدہ ہائے لاینحل سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے اسے ہمیشہ بے چین رکھتی تھی۔ کیونکہ اسکی غیرتِ علمیت کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی سطحی مطالعہ رکھنے والا آدمی بلاغت اللہ کی عدم واقفیت کے باعث ضلالت علم میں اسکی راہبری کرے جس طرح کہ وہ گندم نما جو فروش علما کا اصولی دشمن تھا۔ ایسے ہی اسے اربابِ کمال کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے میں کبھی مضایقہ نہیں ہوا۔ اسکی لائبریری میں ملحدین متشککین ۔مشرکین وموحدین کے فلسفہ عقاید کی کتابوں کا خاصہ انبار ہوا کرتا تھا۔ اِس کا اعتراف مجھے ندامت سے کرنا پڑتا ہے کہ بلاغت اللہ باوجود شخصی تحقیق کے بل پر راسخ العقیدہ ہونے کے باعمل ہونے کی نہ کبھی کوشش کرتا تھا نہ آرزو ہی رکھتا تھا۔ ظاہرا روش اخلاق کو سلامتی کے ساتھ صراطِ مستقیم پر قایم رکھنے کے خیال سے وہ ایک سلسلہ سے تعلق رکھنا باعث برکت اور موجبِ حیات انسانی سمجھتا تھا لیکن اپنے تیئں فرمانِ مرشد کے تحت میں قطعی فنا کر دینے کو انسانی بزرگی کے لئے ننگ و عار سمجھتا تھا۔ بلکہ جہاں اسکے ہم مشرب پاس ادب کے خیال سے سکوت کو احسن سمجھتے تھے۔ بلاغت اللہ بزم مباحثہ میں پیر طریقت سے اکثر الجھ پڑتا تھا جس سے کہ حاشیہ نشینانِ درگاہِ قدسیہ کو اس پر کمیٔ اخلاص کا گمان گذرتا تھا۔ مگر یہ اصول کا پکا شخصیت پرستی کو گناہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ بہت بیباکی کیساتھ

اپنے پیرو مرشد سے اظہار اختلاف کیا کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سلسلہ کے لوگوں میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یہانتک کہ بعض پیر پرست اسے منافق کے خطاب سے یاد کرتے تھے لیکن وہ خود بھی ایسے مذہبی مجنونوں کو حیرت میں ڈال کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اور ایک خندۂ استہزا کے ساتھ کہدیا کرتا تھا کہ تھوڑی سی منافقت تو قیام حیاتِ انسانی کے لئے ضروری ہے"۔

یہ دارفتۂ شوقِ تجسس ایک مرتبہ ایک شیعہ علامہ کے فیضانِ صحبت کے حصول کی غرض سے کامل تین ماہ تک ریگستانِ سندھ کی بادیہ پیمائی کرتا رہا ہے۔ اضلاع سرحد کے موحدین کے گروہ میں شامل ہو کر وہ پورے سال بھر تک آوارۂ وطن رہ چکا ہے۔ بنگال کے ایک داعی مہدویت کے اشتیاق زیارت میں وہ بعد المشرقین طے کر کے جا پہنچا تھا۔ ایک صوفی کامل سے کچھ توشۂ آخرت لے مرنے کے سودا میں وہ بنگلور تک کی زمین ناپ چکا ہے۔ پاکپٹن اور اجمیر کی درگاہوں میں تو اُسنے بارہا جاروب کشی کی ہے بٹالے سے جو کچی سڑک دیارِ محبوب تک صبر آزما درازی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے بلاغت اللہ کے شغف کامل کے مانع نہیں ہوسکی۔ یہ طالب حق اکثر دفعہ جون جولائی کی شدت تپش میں یکے کی اِمتلا اور سواری کی صعوبات برداشت کرتا محض چند ساعت کی عشرتِ روحانی کے شوق میں گرتا پڑتا دیکھا گیا ہے۔ اُس کا مذہبی ہیجان سے ہفتاد و دو ملت کے اختلافات سے بھی گزر کر دیگر مذاہب کی روح پرور چاشنی سے لذت آشنا کرتا رہا ہے وہ اپنی معلومات کے زور پر ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے اجتماع احباب میں حضرتِ زرتشت و عارف باللہ گوتم کے فلسفۂ روحانی اور برہمو سماج و تھیوصافیکل سوسائٹی کے اصولوں پر بسیط تقریریں کیا کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی زندگی کی فراہم کردہ کتب روحانی کا قیمتی ذخیرہ بھی اکثر احباب پر مستعار تقسیم کرتا رہتا ہے اور خدا کے فضل سے اب تک اس نے بہت سے دوستوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے

اسکے اپنے سلسلے کے لوگ اس کے ذوق تحقیق کے باعث اپنے فرقہ کے ساتھ غیر مخلص ہونے کا شک کرتے ہیں۔ ایکدفعہ بلاغت ایک بزمِ عشرت میں مدعو تھے سفرۂ ضیافت پر ہی ایک صاحب نے بلاغت کی منافقانہ طرزِ عمل پر اظہار تاسف کیا بلاغت کے دیگر ہم عقیدہ لوگ بھی بہت متاثر ہوئے۔ ایک مومن صورت شخص جواب تک بے تحاشہ پلاؤ کی قاب پر اوندھے جھکے۔ دادِ پُرخوری دے رہے تھے۔ شرعی لبوں کو صاف کر۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر۔ ایک بڑی سی ڈکار لے کر الحمدللہ کہتے ہوئے فرمانے لگے "کیا درحقیقت آپ ابتلا میں گرفتار ہیں۔ آخر معلوم تو ہو آپ کا دل کس طریق کو قبول کرتا ہے۔ یونہی ہر دیغی چمچہ کب تک بنے رہو گے" بلاغت اللہ نے نہایت سنجیدہ چہرہ بناکر عرض کی کہ "حضرت میں تو رکابی مذہب ہوں" اور بہت بے پرواہی سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ سب لوگ ہنس پڑے اور مستفسر صاحب کھسیانے ہو گئے ۔

یہ تو محض بلاغت کا نقشۂ ایمان ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ باقی جذبات سے بالکل بے حس ہو چکا تھا۔ سیاسی مجالس میں بغیر بلاغتُ اللہ کی شرکت کے رنگ حریت نہیں جم سکتا تھا۔ اِسکے اپنے شہر میں صاحبانِ تملق اس کی غیر حاضری کو غنیمت جانکر چند پھیکے سیٹھے رزولیوشن پاس کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے اور برائے قبولِ خاطر سرکارِ ابدقرار رسم وفائے قلبی کی تشہیر زبانی کے بعد بزمِ احرار منتشر ہو جایا کرتی تھی لیکن جس روز بلاغت اللہ شامل جلسہ ہو تو ممکن نہ تھا کہ میر مجلس اِسکی بے باکانہ تقریروں سے بغیر جزبز ہوئے کرسئے صدارت سے نیچے اتریں۔ مسائل حج و جہاد کے متعلق مسلمانوں کی دون ہمتی کا باعث مصلحینِ قوم کو قرار دیکر تبرا کی بوچھاڑ شروع کر دیتا تھا۔ ایسے ہی نازک موقعوں پر صدر جلسہ کرسی سے اتر کر فرش پر بیٹھ جاتے تھے لیکن بلاغت کا سیلاب رواں کسی طرح نہ رک

سکتا تھا۔ ماشاء اللہ بلاغت کے دم قدم کی برکت سے ہر ایسے اجتماع میں سی آئی ڈی کے متعدد اصحاب بلاغت کی تقریر کو نقش بر دیوار سنا کرتے تھے۔

موسیقی کا بلاغت بہت رسیا تھا اگرچہ اسکے ہم مذہب محفلِ رقص و سرود کی شمولیت میں اسکے بہت مانع آتے تھے لیکن یہ کب ممکن تھا کہ بلاغت جیسا مرض مُستسقاًمیں مبتلا خدائی فوجداروں کے مذہبی ڈھکوسلوں سے مرعوب ہو کر فنون لطیفہ کی داد دینے سے باز رہے۔ شعر و سخن کا چرچا بھی شہر میں فقط اسی کے دم سے تھا۔ غالبؔ اقبال و حسرت کے کلام کا تو وہ حافظ تھا ہی خود بھی کبھی کبھی مشقِ سخن کیا کرتا تھا۔

بلاغت اللہ کی طبیعت حسین چیز کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتی تھی حسنِ صوری تو فوری اثر میں جادو کا کام کرتا تھا۔ لیکن بلاغت اللہ اپنی زبان سے ہمیشہ اپنے تئیں کشتۂ اخلاق ہی ظاہر کرتا تھا۔ چونکہ اس کی فطرت قانع ہونا جانتی ہی نہ تھی اسلئے ثباتِ عشق کا بھی وہ قائل نہ تھا اور کہا کرتا تھا کہ میری زندگی کی تفسیر تو یہ شعر ہے ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

دوستوں پر جان قربان کرنا اسکی زندگی کا بہترین پہلو ہے لیکن ایک حسرت نے اُسے تلخ کلامی کا شکار بنا دیا تھا۔ وہ زندگی میں اپنی رفیقہ کی تلاش میں آجکل کے ہندستانی وجدان کے خلاف محض جسمانی رفیقہ ہی نہ ہو بلکہ دماغی۔ اخلاقی۔ روحانی دوست بھی ہو بہت سرگرداں رہتا تھا۔ اسے موجودہ طریق انتخاب سے اختلاف ہی نہیں نفرت بھی تھی۔ جس کا ثبوت اسنے نہایت خطرناک روش سے دیا تھا عورت کی حسرت تو اسے مدتوں سے تھی۔ لیکن جبکہ اس کے تمام دوست بیاہے گئے اور بیوی والوں کے چہروں پر وہ ایک رنگِ خودغرضی اور تغافل بھی دیکھنے لگا۔

تو اسے بھی بیوی کا جنون ہو گیا۔ مگر اسے تو ایک ایسی بیوی کی تلاش تھی۔ جو اسکے
اضطرارِ مستمرّہ کا علاج ہو سکے۔ جب اسے بڑی کوشش کے بعد بھی اپنے مذاق
کی بیوی میسر نہ آئی۔ تو جھنجلا کر اُسنے مجرد رہنے کی قسم کھالی اور ایک بیچلرز کلب
کی بنیاد ڈالدی۔ چنانچہ افتتاحی تقریر میں اُسنے بڑے زور سے کہا کہ جس حالت
میں سوسائٹی میں ہم ایک دیرینہ دوست کی پیہم لغزشوں پر بیزار ہو کر اسے چھوڑ
دیا کرتے ہیں تو وہ کونسا اخلاقی دباؤ ہو سکتا ہے۔ جو ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
ایک نا اہل عورت کے ساتھ باوجود اختلافِ مذاق کے جکڑ دے پس جب تک
ایک عورت میں ہمیں وہ تمام کیفیات حاصل نہ ہوں۔ جو چند سالہ غیر ارادی آزمایش
کے بعد ایک ہم جلیس میں نظر آکر اسے دوست کے مرتبہ پر پہنچا دیتی ہیں ہرگز
عقدِ نکاح سے پھانسی کا پھندہ گلے میں نہ ڈالا جائے۔ والدین کے حقوق کی نگہ
داری اولاد کا فرضِ اولین ہونا چاہیئے۔ لیکن فقط دو امور میں تمام آداب فرزندی کو
ملحوظ رکھتے ہوئے فرمان پذیری سے احتراز ہی مصلحت وقت ہونا چاہیئے ایک تو
اگر اپنی ہی روشنئ ضمیر سے صراط مستقیم حاصل ہو تو والدین کی بنا کردہ لکیر کا فقیر
ہونا بڑی واژون بختی ہے۔ دوسرے رشتہ مناکحت میں بھی بلا واسطہ اپنی خواہش بالغ
کی رہنمائی کو لوازمہ حیات سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ وہ نکاح جو محض والدین کی رضا جوئی کے
خیال سے کر لیا جائے عمل خودکشی ہوا کرتا ہے اور شریعت اسلامی ایسے جابرانہ
پیوند کو نکاح ہی قرار نہیں دیتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بلاغت اللہ نشۂ آزادی کی ترنگ میں ایک جہان کے
خلاف بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے تلاش معاش میں کوہ
شملہ پر حکام بالادست کی دریوزہ گری کے لئے جانا پڑا میں حسب معمول ناکام
واپس آرہا تھا کہ بلاغت مجھے سٹیشن پر ملا۔ اسکے چہرے سے حزن وملال کے

آثار ٹپکتے تھے مجھ سے ملتے ہی اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی لچھے دار تقریر شروع کر دی اور تمام ملاقات میں مجھے لذت گفتار سے محروم رکھا۔ کہنے لگا الحمد للہ میں تین سال کی قید بھگت کر اب آزاد ہوا ہوں۔ ابا جان نے اس آرزو میں کہ مرنے سے پہلے میرا گھر آباد دیکھ لیں۔ مجھے ہزار طرح کی تحریص دلا کر ایک جاہل لڑکی کے ساتھ بیاہ دیا ایجاب و قبول کی بھی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ مجھے دور دراز سفر پر روانہ کر کے خود ہی میری مرضی کے مختار بن گئے۔ اللہ تعالے انکے اس دروغ الفت کو معاف فرماوے۔ نکاح غیبی پڑھا گیا۔ اور مجھے چاروں طرف سے اس قید محض پر ہمدردی کے خطوط آنے لگے۔ چند ماہ تک تو مجھے اپنی بے جرم سزا پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ آخر میں نے زندان کی زندگی کو اپنے لئے ناگزیر سمجھ کر اسی میں راحت پیدا کرنے کی کوشش کی تین سال کی متواتر مشقت سے میں اپنی بیوی کو اپنے راہ پر لانے میں کامیاب ہوا۔ اب میں اپنے دل میں خوش تھا کہ اگرچہ قبلہ و کعبہ نے توطوق لعنت گلے میں ڈال ہی دیا تھا۔ لیکن بیگم صاحبہ کے تربیت قبول مزاج نے سزائے ناواجب کی سختی کو کم کر دیا۔ میں ہمیشہ اپنی بیگم کو لیلے و شیریں کی زندگی بطور نمونہ پیش کر کے کسب فضایل کی ترغیب دلایا کرتا تھا۔ چنانچہ میری سر توڑ کوشش سے انہیں بھی شد بد اُردو کی لیاقت ہو گئی تھی۔ پنجابی نما اُردو میں مجھے خط لکھ کر پتہ انگریزی میں لکھوایا کرتی تھیں۔ میں اسی میں خوش تھا کہ خیر اگر خیال آفریں بیوی نہیں ملی۔ تو جذبات فہم تو میسر ہے۔ ابھی تک وہ کسی عنوان پر کچھ نہ لکھ سکتیں تھیں۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ ایک عالم کو دھوکے میں ڈال کر میں بھی فرہاد ہندی کی طرح اپنی بیوی کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دوں کہ اچانک بیگم صاحبہ کا ہیضہ سے انتقال ہو گیا اور میری اخباری دروغ بافی کی اُمنگ دل ہی میں رہی۔ لیکن مجھے مرگ مخدرہ سے چنداں صدمہ نہیں ہوا۔ چند روزہ نمائشی رنج کے بعد اب میں پھر بہتر بیوی

کی تلاش میں ہوں۔ کیونکہ اب میری آرزو ہے کہ خاصی عالم بیوی ملے تب ہی بیاہ کروں۔ ایک تو رنج تدریس سے چھوٹوں۔ دوسرے فرہاد کی طرح دوستوں میں بیوی کا جھوٹ موٹ کا سکہ علم بٹھانے کی فکر سے آزاد رہوں۔ اسی لئے خیال ہے کہ کوئی سال خوردہ بیوہ جو میری طرح سب پاپڑ بیل چکی ہو اور جو تنہائی کی بے کس زندگی سے عاجز آگئی ہو مل جائے۔ تو خوب ہو۔ ہاں زنانہ اخبار جاری کرنے کا خیال شادی کا محرک ہو رہا ہے۔ اسی لئے پہلی بیوی کی موت کا چنداں افسوس نہیں۔ کیونکہ اگرچہ ان کی زندگی ہی میں ان کے نام سے رسالہ جاری کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھے اڈیٹری اور مینیجری کا دوہرا کام کرنا پڑتا البتہ دنیا کو دھوکہ دینے میں ایک خاص لذت حاصل ہوتی۔ خیر انکی موت نے فکر فریب سے محفوظ رکھا ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

سال بھر بعد مجھے پشاور میں بلاغت سے ملنے کا اتفاق ہوا میری عزت افزائی میں انہوں نے ایک دعوت پر اپنے سب دوستوں کو بلایا اور اپنی نئی بزم سے مجھے تعارف کرایا۔ فرمانے لگے کہ آجکل ان دوستوں کی چارہ جوئی سے میں مرض شادی سے شفا یاب ہو چکا ہوں اور فقط دوستوں کی بیویوں کا حال سن سنکر خوش ہو لیتا ہوں۔ مسٹر فصیح سے تو مجھے خاص تعلق قلبی ہے اور انکے اخلاق کے مطالعہ نے مجھے بہت بصیرت بخشی ہے۔ کیونکہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے وہ جاہل بیوی سے خوش ہیں۔ تعلقات محبت میں توسن شعور نے تلون ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مسکرا کر کہنے لگے ایسا دوست فروش آدمی بیوی سے کب تک رسم وفا کو قایم رکھتا ہے میرے دوست غلام سرمد تجرد کی سختیاں جھیلنے میں تو بالکل میری طرح ہیں لیکن نہیں مرض خاموشی لاحق ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ کبھی اس مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالتے

میرے مکرم مرزا شمشاد تو آدمی نہیں جن ہیں جن اجفا کشی میں ہرقل ثانی ہیں عشق آفریں کیفیات کے مظہر کامل ہیں۔ دوستوں پر دل و جان سے قربان ہیں۔ وفا کے پتلے ہیں میرے تو محسن ہیں۔ آپکے قرعہ نکاح میں ایک گاؤں کی نیک بخت آئی ہیں لیکن انہیں پر فدا ہیں کہا کرتے ہیں کہ ان کی تہجد و قرآن خوانی نے تو مجھے بھی مسلمان کر دیا۔ اے خدا مجھے بھی کوئی ایسی ہی حور صحرائی بخش جو میرے تجدید ایمان کا باعث ہو۔ ہاں مظہر الاسلام صاحب کے ذوق الفت کا میں قایل ہوں۔ کیونکہ باوجود پڑھی لکھی بیوی رکھنے کے مستغنی ہی نظر آتے ہیں۔ شاید وہ ہندوستان کے طبقہ نسوں کی مقدار تعلیم کو اپنی بلندی فکر سے بہت نیچا سمجھتے ہیں۔ میرے تمام دوستوں میں پروفیسر ایڈم سن کی حالت واقعی قابل رحم ہے جس طرح ہماری سائیٹی میں علم و فضل میں سربلند ہیں ویسے ہی والدین کی اندھی محبت کیوجہ سے بچپن ہی سے انہیں پھوڑ و بدماغ بیوی سے پالا پڑا ہے۔ اگرچہ ہم لوگوں کو تو وہ اپنے دہریت کے خیالات سے عاجز کئے رکھتے ہیں۔ مگر جب بیگم صاحبہ انہیں بے نقط سناتی ہیں تو دم نہیں مار سکتے۔ دو میں نے تو قسم کھالی ہے کہ جب تک مظہر الاسلام صاحب کے معیار ذوق کی بیوی نہ ملے میں تمہاری طرح صحرا نوردی کو شہری زندگی پر ترجیح دیتے رہوں گا۔

پشاور سے واپسی پر ایک خط ملا کہ میں تو شادی کبھی نہ کرتا لیکن ایک صدمہ عظیم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ اور اس غم کو بہلانے کے لئے مجھے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے آہ فصیح جیسا عزیز دوست مجھے ایک ادنے حیثیت کی لڑکی پر قربان کر دے اور میں ایسی ہتک دیکھنے کے لئے زندہ رہوں۔ پیارے بھائی میں نے اپنی تمام زندگی کی آرزوئیں فقط اس تعلق محبت کیساتھ وابستہ کر دی تھیں جب اس نے ہی میری جانفرد شیوں کی ایسی ناقدری کی تو اب کسی دوست پر کیا

اعتماد کروں۔مرزا شمشاد بیگ کا فرمانا بالکل بجا تھا کہ دُنیا میں حقیقی دوست سوائے بیوی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔مرد ضرور بے وفا اور خشک دماغ ہوتے ہونگے۔ لیکن بیچاری جفاکش بیوی جس کی انبساطِ روحانی کا مدار فقط خاوند کی ایک پُرفریب زیرِلب مسکراہٹ پر ہوتا ہے کبھی خاوند سے بے توجہی نہیں کرسکتی۔آہ عورت تیرے پیمانِ وفا کو کوئی ارضی طاقت نہیں توڑ سکتی۔مرد کی بدعہدی جفا پروری اور مسلسل نفرت تجھے اور زیادہ آمادۂ وفا کرتی ہے۔تمام دوستی کے تعلقات دنیا ہی میں ختم ہوجاتے ہیں۔ایک دوست کی موت دوسرے کو قیدِ محبت سے آزاد کردیتی ہے۔لیکن اگر کلامِ الہی افتراعِ انسانی سے پاک ہے تو اے عورت فقط تو ہی مرنے کے بعد بھی گنہگار مرد کو آتشِ جہنم سے بچانے کا باعث ہوگی۔کیونکہ تیری بے غرض خدمات کا سلسلہ دنیا ہی میں ختم نہیں ہوگا۔بلکہ آخرت میں بھی تو جورِ پُرمعصیت مرد کو ابدی بہشت میں لے جائیگی اور وہاں بھی مرد کو تیری نامنقطع خدمات سے عشرتِ دوام حاصل ہوگی ؛

پس عرض پرداز ہوں کہ جمعۂ آیندہ کو میری تقریب نکاح خوانی پر تشریف لاویں۔ہاں آپ کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ اس دفعہ حقِ انتخاب میں نے مظہر الاسلام صاحب کو دیدیا ہے۔کیونکہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا معیار بیوی کے متعلق کس قدر بلند ہے۔پس مجھے کلی اعتماد ہے کہ جو خاتون مجھے حضرت مظہر الاسلام کے توسل سے میسر آئے گی۔مادی دُنیا سے واقف ہونے کے علاوہ جذبات فہم ہوگی“؛

میں اپنے مصائب میں گرفتار تھا۔شریک برات نہ ہوسکا لیکن مجھے اب ہیں شوق تھا کہ دیکھوں بلاغت کی آزاد زندگی شرعی فرائض کے ماتحت کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔کیونکہ ابھی تک تو انہوں نے تعلقاتِ الفت کے سوا خانہ داری ذمہ واریوں کو سوہانِ

روح سمجھکر پاس نہ آنے دیا تھا۔ میں نے مکان پر دستک دی معلوم ہوا کہ وہ متصل مسجد میں مل سکتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ صبح دس بجے تک مسلمان نما بلاغت کو اس مقام سے کیا وابستگی ہوتی ہے۔ مسجد کے صحن میں ملاقات ہوئی۔ مجھے اپنے ساتھ ایک حجرے میں لے گئے۔ ٹھنڈی سانس بھر کر فرمانے لگے "میں اس مسجد کا درویش ہو گیا ہوں۔ یہ تنگ و تاریک حجرہ میرے لئے کافی ہے۔ جب سے بیوی کی لعنت میرے پیچھے پڑی ہے میں بیک بینی و دو گوش زندہ درگور یہاں پڑا رہتا ہوں۔ اس حجرے کی چھت پر سے ایک رستہ میرے گھر کو (جو پہلے میرے لئے بہشت تھا اب دوزخ کا نمونہ ہے) جاتا ہے۔ آہ۔ میرا انجام بالکل سید انشا مرحوم کا سا ہوگا۔ میرے عزیز میرے لئے عذاب کے فرشتے ہو گئے ہیں۔ اگرچہ میں بھی انکی آزار رسانی کا مقابلہ جان توڑ کر کرتا ہوں لیکن جب وہ سنگ دل بہلا پھسلا کر مجھے ملحق دوزخ میں دھکیل دیتے ہیں۔ تو وہ تمام کیفیات جو گنہگاروں کے لئے جہنم میں مخصوص ہیں یکبارگی میرے دل و دماغ پر طاری ہو جاتی ہیں"۔

میں داستانِ غم کا دیباچہ سنکر سمجھ گیا کہ یہ تمام کرشمے بیگم صاحبہ کے کھلائے ہوئے ہیں اور اپنے دوست کی مصیبت سے متاثر ہو کر عالمِ خیال میں چلا گیا تھا کہ بلاغت نے مجنونانہ میرے شانہ کو ہلا کر کہا "سنتے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں نیک کردار لوگوں کو پسِ مرگ جنت میں نشاط روحانی کے لئے حوریں ملیں گی۔ ضرور ہے۔ کہ جہنم والوں کو حور کے بجائے چڑیل کی قسم سے کوئی چیز گلے کا ہار ہو سن لو میرا گھر دُنیا ہی میں مجھے جہنم مل گیا ہے اور اس کے پیراستہ کرنے کو حور کا نعم البدل میری بیوی موجود ہے"۔ میں نے عرض کی "آپ تو کہا کرتے تھے کہ اگر خدائی ٹھیکیداروں نے ہم پر قابو پالیا اور ہم لوگ انکے تعمیر کردہ خیالی دوزخ کے حوالے کر دیئے گئے۔ تو اپنی لیاقت سے اسے بھی بہشت ثانی بنالیں گے حیرت ہے کہ آپ جہنم ارضی

سے اِس قدر ہراساں ہو رہے ہیں؟"

بلاغت اللہ آب دیدہ ہو کر بولے "آہ مجھے ابتک یہ علم نہ تھا کہ جہنم میں حور کا بدل بھی موجود ہوگا۔ خدائی فوجداروں کی دھمکیاں تو فقط جسمانی عقوبت تک ہی تھیں اُن سے تو شاید بچاؤ کی صورت نکل آتی۔ لیکن یہ ہر وقت کی روحانی کوفت برداشت نہیں ہو سکتی۔ شروع شروع میں خیال تھا کہ اگر عنس قابل ہوئی تو تربیت سے حسب توقع بنا سکونگا۔ لیکن چند ماہ کی سر دردی سے ثابت ہؤا کہ وہ تو اہلیت ہی نہیں رکھتی اندھے کے آگے رونا اپنے دیدے کھونا۔ جب میں کوئی بات کہتا ہوں تو میرے منہ کیطرف تکتی ہے مکرر سہ کرر سمجھانے سے کچھ الٹا پلٹا سے جواب دے کر پھر چپ ہو جاتی ہے۔ ہائے غضب بول چال میں تلفظ بھی تو گنواری ہے۔ سبق پڑھاتے وقت بڑی دقت ہوتی ہے۔ ش۔ ق وغیرہ حروف ابھی تک زبان پر نہیں چڑھے۔ پہلے ہی سبق میں میری ماں نے ف کا تلفظ درست کرانا چاہا جب سب طرح ہار گئیں تو کہنے لگیں۔ بیٹی تمہارے نام میں بھی تو ف آتی ہے۔ بتاؤ تو تمہارا نام کیا ہے؟" میں بھی پاس کھڑا تھا۔ جواب سنتے ہی مجھ کو چکر سا آنے لگا آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ میں نے اسی وقت سے اپنا سامان اس حجرے میں ڈال لیا ہے اور اب گھر جانے کی قسم کھالی ہے۔"

میں نے پوچھا آخر انکے جواب میں ایسا کیا زہر بھرا تھا۔ بلاغت اللہ نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا "اس نے میری والدہ کو بڑی بے تکلفی سے جواب دیا ہُمارا نام پھاتماں ہے۔"
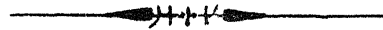
شہیدِ خیال

عزادار حسین کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جبکہ وہ بچپن کی خود فراموشی کے عالم میں اسم بامسمےٰ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوا تھا۔ اس کی پیدائش ہی ایسے والدین کے گھر میں ہوئی تھی جنہیں مدت العمر کبھی عشرتِ کامل میسر نہ آئی تھی۔ یوں تو اس خاندان کو غم و اندوہ سے فراغت کبھی بھی نہیں ہوئی۔ لیکن عزادار حسین کی ولادت کُنبے بھر کے لئے نحوست اثر سمجھنی چاہیئے۔ عزادار نے جب دُنیا میں آنکھیں کھولیں تو خدا کے فضل سے ددھیال ننھیال دونوں طرف سے خوش نصیب تھا لیکن چھٹی کے اندر ہی اسکے ضعیف العمر دادا نے انتقال کیا اور گھر میں سنّاٹا چھا گیا۔ میراثنیں ڈومنیاں اپنی قسمت کو روتی واپس ہوئیں چھٹی چلّہ کی رونق اور دھوم دھڑکے کی بجائے تعزیت کی صف بچھی۔ خدا جانے اس بزرگ کی زندگی میں کیا برکت تھی تمام گھر آدمیوں سے بھرا نظر آتا تھا۔ اسکے آنکھیں بند کرتے ہی بھرا گھر ویران ہو گیا۔ عزادار کی دادی نے وطن سے باہر نکلنا پسند نہ کیا اور دل پر پتھر کی سِل رکھ کر اپنے سب سے بڑے بچے یعنی عزادار کے والد غمگسار حسین کو تلاشِ معاش کی اجازت دی۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ غمگسار حسین کو گھر سے علیحدہ ہونا پڑا۔ والد کے مرتے ہی دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ ضعیف ماں کا سنبھالنا۔ بیوی کی ذمہ داری بھائیوں کی دلداری چھوٹی بہنوں کی پرورش اور شادی کی فکر اور اپنی بے روزگاری نے اسکے حواس زائل کر دئے۔ رخصت کے وقت بیوی سے ملنے گیا۔ دُور دراز سفر کے خیال سے اپنی زندگی کی رفیقہ کو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ اس کی نظر عزادار پر پڑی آواز حلق میں رُک گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور لرزتی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا جس کے

کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا۔

ابھی عزادار چوتھے مہینے ہی میں تھا اور اس کے والد کی کہیں روزگار کی سبیل بھی نہ ہوئی تھی کہ شہر میں ہیضے کی وبا پھیلی اور عزادار کا جوان چچا اس مردم خور بلا کی بھینٹ چڑھا۔ ہندوستانی گھر چاہے کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو نسوانی جہالت سے کیسے پاک ہو سکتا ہے۔ بچہ محلہ بھر میں منحوس مشہور ہو گیا۔ اور اندر ہی اندر ساس بہوؤں میں کدورت پھیلنے لگی۔ ساس پرانے وقتوں کی نشانی ہر واقعہ کی بنا فال و شگون پر رکھنے والی بھلا رستے بستے گھر میں ایک چھوڑ دو موتیں ہو جائیں۔ نازوں کا پالا بچہ دیس سے پردیس میں ٹکڑے کی تلاش میں مارا مارا پھرے۔ سوائے بہو کے اور کس کے سر اس ادبار کا بوجھ ڈالتی۔ بہو ناگن سمجھی جانے لگی۔ بچہ سنپولیا۔ آتے ہی آتے دادا چچا کو ڈس لیا۔

ملازمت پیشہ لوگ جنہیں وضع داری کو قائم رکھنا ہو قلیل معاش میں کیا پس انداز کر سکتے ہیں۔ عزادار کی تین پھوپیاں بیاہنے لائق بڑی بی اچھے وقتوں کا تبرک قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ شب و روز یہی خیال دامنگیر رہتا تھا کہ کسی طرح بچیاں بیاہی جائیں تو اس اہم فرض سے اپنی زندگی میں سبکدوش ہو جائیں۔ ان کے بعد معلوم بھاوج نندوں میں کیسے بنے۔ اب تو موقع اچھا تھا۔ اپنی بہن کے تین لڑکے رشتے کیلئے منتخب ہو چکے تھے البتہ کمی تھی تو روپیہ کی۔ تھوک کے ستو تو گھوئے نہیں جا سکتے۔ شرعی عقد بھی ہو تو کم از کم تینوں بچیوں کے گہنے پاتے کیلئے کچھ ہونا چاہیئے۔ تاشے باجے نہ سہی۔ شربت کے پیالے پر ہی نکاح پڑھا جائے۔ تو عمدہ بری تو ساتھ لیکر سسرال جائیں۔ پاس کوڑی نہیں اور کوئی ذریعہ آمدنی کا نہ تھا۔ غرضیکہ زمین فروخت کرنے کی ٹھیری۔ کچھ موت نے صفایا کر دیا تھا۔ ادھر زمین ہاتھ سے گئی۔ گھر میں ٹوٹ کر نیستی آگئی۔ لڑکیاں سسرال گئیں لڑکا ملازمت پر چلا گیا۔ ایک بہو دو لڑکے اور ایک عزادار کی ننھی سی جان اور بڑی بی ٹھنڈی سانسیں بھرنے پر باقی سب گھر میں سناٹا ہو گیا

اچھا خاصا محرم کا سماں بندھ گیا۔
برس کے اندر عزادار کی نانی کا انتقال ہو گیا۔ نانا نوکری سے پنشن لیکر گھر آنے کا سامان کر رہے تھے کہ ملتان کے حق نمک نے اُنہیں وہیں باندھ رکھا۔ جہاں بیندرہ برس ریاست میں بسر کئے تھے۔ وہیں پیوند زمین ہوئے۔ عزادار کے سوتیلے تایا، چھوٹی پھوپھیوں جوان شیر ماموں۔ دو کڑیل جوان چچوں نے پانچ سال کے اندر اندر انتقال کیا۔ عزادار کے اپنے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی نے سال بھر سے زیادہ عمر نہ پائی جب عزادار سنِ شعور کو پہنچا۔ تو سارا گھر خالی ہو چکا تھا۔
مجھے عزادار کو پہلی بار مکتب میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چونکہ میں خود جماعت میں تمام طلباء سے علٰحدہ گوشۂ تاریک میں اپنے تئیں چھپائے رکھنا پسند کرتا تھا اس لئے شورش پسند بچّوں کی شرارت جو نگاہ سے پنہاں ہو کر عزادار کی حرکات کو مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ بعض باتوں میں عزادار مجھے اپنا مثنٰے معلوم ہوتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ شکل و شباہت میں بھی مجھ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مذاق تو اس کا اور میرا تقریباً یکساں تھا۔ بہت شوخ طبیعت اور چلبلے مزاج کے لڑکوں سے جیسے مجھے مغائرت تھی۔ ویسے ہی اسے بھی نفور تھا۔ لیکن اس کی خاموشی طبعی نہیں معلوم ہوتی تھی بلکہ مخاطب کو نا اہل سمجھ کر وہ مہر بلب رہتا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے شکن جیسے کہ بعد میں اس کی اندرونِ قلب کی کیفیات کو ظاہر کرتے تھے۔ اُس وقت بھی مجھ سے زیادہ عمر والے لوگوں کے لئے بصیرت بخش ہوتے ہونگے لیکن میں اُن سے کوئی گہرا نتیجہ اخذ کرنے کے ناقابل تھا۔ مجھے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے رونے کو طعنِ اغیار کے خوف سے ضبط کرتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کے تمام شکن مسلسل گریۂ خشک کی لہریں تھیں جو ذکی الحس دل سے اٹھکر پژمردہ چہرہ پر پھیل جاتی تھیں۔
مجھے عزادار سے ہمدردی پیدا ہوتے ہی محبت کی نوبت پہنچ گئی اور تمام تغافل اور

جفا پروری کی سختیاں جو مجھ پر لیلےٰ کے ہاتھوں گذرتی تھیں۔ مَیں عزادار کے گوش گذار کر کے اُسے اپنے مصائب خیالی پر رلوا تارہتا تھا۔ مَیں حیران ہُوا کرتا تھا کہ یارب لیلےٰ کے فسانے میں کونسا جادو ہے۔ جو عزادار حسین جیسے بے تعلق انسان کو دوسرے کی تکلیف سے متاثر کر کے زار و قطار رُلوا سکتا ہے۔ لوگ اُسے دائمی مغموم دیکھ کر بزمِ احباب میں مصائب موہومہ کا نوحہ خوان خیال کیا کرتے تھے حالانکہ مجھ سے تنہائی کے اوقات میں وہ اسقدر بے ربط باتیں کرجاتا تھا کہ مَیں اس کے چلے جانے کے گھنٹوں بعد تک اس کی ساختِ دماغ پر غور کر کے محو حیرت رہا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ غم افروز حکایات تو بہت دلچسپی سے بیان کر سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ ہر مسئلہ پر مجھ سے بحث کرنے پر تیار ہوتا تھا۔ قاطع دلیل سُن کر بھی اقرارِ شکست نہیں کرتا تھا بلکہ نہایت شوخی سے پہلو بدل کر مجھ پر دائیں بائیں سے وار کئے جاتا تھا۔ ہاں ایسے موقعوں پر اسے چُپ کرانے کی فقط ایک ہی ترکیب تھی یعنی دوستوں کی بے مہری کا ذکر۔ جسے وہ اشارتاً سُنکر بھی بے ضبط ہوجاتا تھا۔ یہی موقعہ ہُوا کرتا تھا۔ کہ اس سے عجیب عجیب حرکاتِ مجنونانہ سرزد ہوجاتی تھیں۔ جن پر سنجیدگی سے غور کرنے پر وہ بہت نادم ہُوا کرتا تھا لیکن اُس وقت جبکہ اُسپر جنون کا دورہ ہو کوئی صلاح یا دلیل اثر نہیں کرتی تھی۔ اور وہ پُرانے سودایوں کی طرح بہیم ناچتا منہ چڑاتا یا چیخیں مار مار کر روتا رہتا تھا۔ تاآنکہ ورزش جنون سے تھک کر سو جاتا تھا۔ اور خواب سے بیدار ہو کر مخمور آدمی کی طرح اپنی بے اختیاری کی حالت پر بہت شرمسار ہوتا تھا لیکن یہ اسکے بس کی بات نہ رہی تھی۔ غالباً اس کے دماغ میں کوئی نقص تھا۔ یا کوئی بنیادی ٹکی رہ گئی تھی اور اس حصّہ دماغ کا تعلق کسی رگ کے ذریعہ دل کیساتھ ایسا تھا۔ کہ خفیف سا صدمہ دل پر اثر کرتے ہی اسکے دماغ کے اُس ناقص حصّہ کو حرکت میں لے آتا تھا۔ اور پھر جو حرکات اس سے ظاہر ہوتی تھیں۔ غالباً اُسی نقصِ دماغ کے باعث ہُوا کرتی ہونگی ؎

اس کی زندگی ذکی الحس ہونے کی وجہ سے اس کے لئے عذاب ہو گئی تھی مجالس میں اچھا خاصا مزے مزے کی باتیں کرتا کرتا کسی دوست کے ایک پُر تغافل فقرے سے متاثر ہو کر عالم خیال میں چلا جاتا تھا۔ اور اُس کی اپنی طبیعت اس کے حق میں عقوبتِ جہنم کے برابر ہو جاتی تھی۔ ماضی کے صدمات بیک اشارتِ جفا سب تازہ ہو جاتے تھے۔ اور انہیں کی بنا پر اسے مستقبل تاریک نظر آنے لگتا تھا۔ ایسی حالت میں ہمدردوں کی شفقت اسے تصنع اور منافقت معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ تنہائی چاہتا تھا۔ اِس لئے نہیں کہ شورشِ عالم سے یک سو ہو کر حالت سکون میں پڑ رہے بلکہ اپنے آپکو اکیلا کمرے میں بند کر کے جہاں اسے مداخلت کا ذرا بھی خدشہ نہ ہو وہ اپنے تئیں سپردِ جنوں کر دیتا تھا۔ آہ اس کی وہ حالت حقیقت میں چشم انسان کے مشاہدے کے لائق نہ ہوتی تھی۔ وہ کبھی تو قہقہہ مار کر ہنستا کبھی بلبلا کر رو دیتا تھا اور اپنے آپ کو کوس کاٹ کر دل ٹھنڈا کرتا تھا۔ یہانتک کہ جسمانی طاقت اسے جواب دے دیتی تھی۔ اور وہ تھک کر پڑ رہتا تھا۔ مجھے اس کی ایسی مذبوحی کیفیت دیکھنے کا فقط دو مرتبہ اتفاق ہؤا تھا۔ جبھی مَیں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ غریب اس دُنیا میں بہت تھوڑے دن کا مہمان ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عزادار اگر طباع نہیں تو ذہین ضرور تھا۔ لیکن اُسنے وقف خیال ہو کر اپنا مستقبل تباہ کر لیا تھا۔ روزمرہ کے معمولی واقعات اسے رنج و غصہ کے باعث تپ لرزہ میں مبتلا کر دیتے تھے۔ اپنی جان پر ہی ستم کرتے کرتے وہ اگرچہ جبر کا عادی تو ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی ضدی بھی ہوتا جاتا تھا۔ شوقِ مطالعہ اگرچہ اسے قدرت سے ودیعت ہؤا تھا لیکن صدمات کی تاثیر اس کے دماغ میں ایسی جاگزیں ہوتی تھی۔ کہ وہ کسی پیچیدہ مسئلہ کو طالبعلمانہ ذوق کے ساتھ کامل توجہ صرف کر کے حل کرنے کے ناقابل ہو گیا تھا۔ طالبعلم کو بوقت مطالعہ تمام دُنیا کے افکار سے یکسو ہو کر حصولِ مدعا

کے پیچھے پڑنا چاہئے لیکن یہی امر عزادار کے لئے ناممکن تھا۔ ادائیگی فرائض کے دوران میں بھی وہ اندیشۂ خیالی میں گھرا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کالج میں وہ طالبعلمانہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔ ابھی وہ فارغ التحصیل بھی نہ ہوا تھا کہ اسکے والد نے اسے اس دنیا میں بالکل لاوارث چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کیا۔ میرے تعزیت نامے کے جواب میں جو خط مجھے عزادار سے ملا۔ وہ اس کے خیالات کا صحیح نقشہ تھا۔ عام روش سے یوں تو اُسے ہمیشہ ہی نفرت رہی ہے لیکن اس دفعہ تو شاید غم و اندوہ کی کثرت میں وہ القابِ رسمی لکھنا بھی بھول گیا اور مصیبت نامہ یوں ہی شروع کر دیا:

"اس آفت ناگہانی میں آپ کی ہمدردی میرے لئے بہت فریب دہ ہے لیکن آہ میں چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھے آپ کی طرح دامِ محبت میں گرفتار کرے۔ تاکہ میں حقیقت بین نگاہ کو بند کر کے ہمیشہ کے لئے اس راحت آفرین خواب کے واسطے وقف ہو جاؤں میں مرنے والے کے لئے موت ہر حالت میں رحمتِ الٰہی سمجھنے لگا ہوں۔ اگر میں موت کو صدمہ سے تعبیر کروں تو اس صدمہ کا اثر فقط ان لوگوں سے وابستہ سمجھتا ہوں۔ جنہیں موت کے باعث مادی اخلاقی یا قلبی نقصان محسوس کرنے کے لئے زندہ رہنا پڑتا ہے پس میرا والد مرحوم کی موت پر واویلا کرنا خالص خود غرضی پر مبنی ہے۔ کیونکہ اسمیں مرحوم کے ساتھ ہمدردی کو کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ میری ہمدردی کے محتاج ہیں ان کے بعد الموت کیفیاتِ قیاسی پر مجھے کوئی اعتماد نہیں رہا۔ کیونکہ مذہبی خوابوں کی تعبیریں ایسی ہی مختلف المعنی ہیں۔ جیسے کہ مفسر مختلف الخیال ہیں۔ اگر مذہب دنیا میں سکونِ قلب مہیا کر سکتا ہے تو مجھے یہ افسوس سے اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ میرے لئے ریاضتِ روحانی تسکین آور نہیں ہو سکتی۔ میری شکایات پابندِ قیود مذہبی ہو کر اور زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہیں۔ میں تو ایک انسانی موت اور ایک چڑیا کی موت کو تحرک خون کے بند ہو جانیکا لابدی نتیجہ سمجھ کر یکساں خیال کرتا ہوں۔ البتہ اس موت نے مجھ پر انسانی تعلقات

کو عارضی ہی نہیں۔ بلکہ پُر فریب ثابت کر دیا ہے۔ میرا تو کلیجہ شق ہوتا ہے۔ اِس خیال سے کہ زندگی کی مہلتِ قلیل میں اگرچہ تعلقات ہم پیدا کرتے ہیں۔ تو اس اعتبار پر کہ یہ رفاقت جسمانی و رُوحانی رنگ میں دائمی ہوگی۔ لیکن موت کے ساتھ سابقہ پڑنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ مسلسل تحرکِ خون میں ایک اتفاقی سکوت تمام تعلقاتِ دائم الخیال کو ہمیشہ کے لئے قطع کرنے کو کافی ہے۔ پس اگر محکم سے محکم رشتۂ محبّت بھی ایک فرد کے تارِ نفس کے ساتھ ہی ٹوٹ جاتا ہو تو وہ لوگ جنہوں نے زیست کا نصب العین تبلیغ محبّت قرار دے رکھا ہے۔ اندھا دُھند نقصان آور سودا خرید رہے ہیں۔ جسکا انجام شکستِ آرزو کے ساتھ ممکن ہے۔ قطع حیات کا باعث بھی ہو جائے۔ کیونکہ جب انسان کو اپنی قوی ترین خواہش سے مایوسی ہو تو اس کا علاج بسا اوقات موت کر دیا کرتی ہے ؎

مکن آشنائی اے دل بکسے کہ نزد دانا
دو سہ روزہ آشنائی ز شناختن بنیر زد

وطن پرستی کو تو مَیں پہلے بھی شرکِ مکانی سمجھتا تھا۔ لیکن اب تو وطن ہی نہیں رکھتا جس کی محبّت مجھے پرستش خیالی سے مانع آئے۔ اس وقت دُنیا میں میرا کوئی غمگسار نہیں۔ نہ مَیں کسی کے لئے ذمہ وار ہوں مَیں بالکل خانہ بدوش ہو چکا ہوں جب ایک جگہ اقامت ہو تو تمام تعلقاتِ قرابت اُسی مختصر سے مقام پر میرے اپنے جسدِ خاکی کے گرد فضائے متخیلہ میں محصور ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ سے باہر میرا سوتت کسی سے رشتہ نہیں۔ ایک ذرہ بیمقدار ہوں۔ جو حوادثاتِ زمانہ کے تھپیڑوں سے فضائے عالم میں اُڑتا پھرتا ہوں۔ جو زندگی دُنیا کے لئے یا کم از کم شخصی کسبِ فضائل وارتقائے رُوحانی کے لئے موزوں نہ ہو۔ اِس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اب اگر مَیں زندہ بھی رہوں تو سوائے اسکے کہ بُرا بھلا ٹکڑا اپنی تن پروری کے لئے مہیا کر لیا کروں۔

ی طرح بھی دُنیا کے تمدن کو فروغ دینے میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ پس میری موت
م سے ایک عضوِ معطل کو قطع کردیگی۔ اس لئے میرے ہم قوم جتنی جلدی اس مرض
سے شفایاب ہو جائیں۔ اتنا ہی خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ میں ہر وقت اس جزوی
وت کو جو شفا بخشِ کُل ہو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہوں+ دعا گو عزادار"

میں عزادار کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ خود جا کر اسے اپنے ساتھ لے آیا۔
لن میرے ساتھ رہ کر اس کے جنون میں اور زیادتی ہوتی چلی گئی۔ اب وہ مذہبی تمدنی
غلاقی مسائل پر مجھ سے زیادہ اُلجھنے لگا۔ اگر کبھی میں اس کے انوکھے خیالات سے
خلاف ظاہر کرتا تو وہ کئی گھنٹے خاموش رہ کر گذار دیتا لیکن پھر بھی جب اس کی
بان کُھلتی تو ہمیشہ موجودہ تہذیب کی ہجو میں میرے تمام دوستوں کا وہ شاکی تھا
ر مجھے تنہا زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے تمام دوست
رم سازی میں ماہر ہیں۔ انبساط افروز اشغال مہیا کر سکتے ہیں۔ ان کی صحبت بوجہ
ن کی وسیع معلومات کے دُنیا فہمی میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اُن میں سے ہر ایک مجلس
رمانے کا سلیقہ رکھتا ہے لیکن ان کے ساتھ تاحیات رشتۂ محبت قائم کرنے کی
رزو کرنا سخت غلطی ہے اور اگر مجھے ایسا خیال پیدا ہو گیا ہے تو گویا میں خود فریب
ردہ ہوں اور شاید ایسے ہی میرے دوست بھی میری جانب سے دھوکہ میں ہوں
س کا نتیجہ یہی ہے کہ میں اور میرے دوست بلکہ دُنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ
شاید غیر لوگوں کی نگاہ میں ہماری ظاہری روش دوستی استقامتِ جاویدی کی ضامن ہو
رہ کہا کرتا تھا کہ آجکل دوستوں کی زندگی مغربی کلب کی زندگی کی طرح ہو گئی ہے جہاں
لاناغہ اکٹھے ہو کر یہ لوگ ہنس کھیل لیتے ہیں۔ حالانکہ دل میں ایک دوسرے سے
مغائرت نہیں تو اُنس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عزادار میں حسد و رقابت
کا جذبہ بھی بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ جس دوست سے مجھے وہ زیادہ بے تکلف دیکھتا

تھا۔ اسی کے بیہودہ زیادہ جوش اور رنگ آمیزی سے کیا کرتا تھا آہ میری لیلے کی تو جان کا دشمن تھا۔ حسن صوری سے اسے نفرت ہو چلی تھی۔ کہا کرتا تھا کہ "خیرہ کن حسن جس میں شوخی کی آمیزش سے سیماب وار تڑپ پیدا ہو جائے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیفیاتِ اندوہ سے متاثر ہونے والے لوگ جن کے بلندیٔ اخلاق کے حسن مستور پر شوق آفرین خاموشی کی مہر لگی ہو۔ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں" بیوی کے متعلق اس کی بحث سن سن کر میں اُکتا گیا تھا۔ لیکن اس کے لئے یہ قصہ ہمیشہ تازہ ہؤا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا "کہ میں ہر ایک دوست کی شادی کو اپنے لئے مرگِ دوستی سے تعبیر کرتا ہوں۔ کیا غضب ہے کہ سالہا سال کے آزمودہ دوست کو یہ دنیا پرست لوگ ایک جاہل ہندوستانی نوخیز لڑکی پر جس کے انتخاب میں انہیں قطعی دخل نہیں ہوتا قربان کر دیتے ہیں پچیس سال بعد کی نئی نسل کے تمدن اور مذاق، کو گذشتہ نسل سے کوئی مناسبت نہیں رہتی۔ پھر حیرت ہے کہ آجکل کے تعلیمیافتہ نوجوان کی بیوی کا حق انتخاب پچھلی صدی کی طوطا کہانی پڑھی ہوئی دادی صاحبہ کو دیا جاتا ہے۔ دادی جان کی حماقت کی ذمہ وار تو ان کی اندھی محبت ہو سکتی ہے لیکن وہ صاحبیت میں رنگا ہؤا فلسفی نوجوان جو کالج میں علمی بحث میں پروفیسر کا ناک میں دم کر دیتا ہے اور اپنی استعدادِ علمی کے دم خم پر اپنے تئیں قیودِ مذہبی سے بلند سمجھ کر گروہ متشککین میں شامل ہونا باعث فخر سمجھتا ہے اس جبری قانونِ مناکحت سے کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے"۔ میں عزادار کی زبانی لیلے معصوم لیلے کی ہجو سنکر دم بخود رہا کرتا تھا کیونکہ اگر ذرا بھی اپنی مایۂ زلیست لیلے کے اوصاف بیان کرنے لگوں تو یقیناً عزادار جوشِ جنون میں مجھ پر حملہ آور ہوتا۔ ورنہ کم از کم اپنا سر پھوڑ لیتا۔

اسی طرح مذہب میں وہ علمائے امت کی کامل اطاعت کو اپنی شخصیت کی ہلاکت سمجھتا تھا۔ سوال بیعت پر اس کے بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ زبان سے

الفاظ نہیں انگارے نکلتے تھے۔ جو مخاطب کے خرقۂ تقوے کو پھونک ڈالنے کیلئے نارِ جحیم کا کام دیتے تھے۔ قولاً سرسید مرحوم کا بڑا معتقد تھا لیکن عملاً احمدیوں سے ایک قدم آگے تھا۔ قادیان دارالامان کی عظمت تو ہر احمدی کے دل میں ہو گی لیکن وہ مقامِ محمود کی منزل اوّل کو مقدس باب "الدخل" بٹالہ شریف کے نام سے یاد کرتا تھا اس پر بھی بروز عاشورہ عزاداران شہید اعظم کی صف میں بڑے جوش و خروش سے سینہ کوبی کرتا دیکھا گیا ہے۔ بُت پرستوں کو مشرک کہنے اسے بڑا تامّل ہؤا کرتا تھا۔ کیونکہ وجدانی کیفیت سے مجبور ہو کر وہ خود بھی دہلی میں شہیدِ فرنگ جان نکلسن کے مجسمے کے آگے کئی دفعہ سرخم کر چکا تھا۔ دوستوں کے خطوں کو تو اکثر وہ کھولنے سے پہلے چوم لیا کرتا تھا۔

مجھ سے رُخصت ہو کر عزادار دو سال تک بیکار پھرتا رہا۔ اور بوجہ ناکام زندگی کے اسکی حالت اب بہت زیادہ مغموم رہنے لگی تھی میں اسکے متعلق بہت فکر مند تھا لیکن مجھ سے کوئی علاج بھی ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ غم و اندوہ کی داستان مجھے سُنا کر اپنا غم ہلکا کر لیا کرتا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے اسکے خطوں میں وہ جوش باقی نہ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوستوں کو نامحرم سمجھنے لگا ہے اور چونکہ اس کا مذاق جنون پسند تھا اس لئے وہ دوستوں کو اپنے حالات سے واقف کرتے جھجکتا تھا انہیں ایام میں مجھے اس کا ایک خط ملا جو حیرت میں ڈالنے والا تھا۔

"بھائی والد مرحوم کی وصیت کو پوری کرنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں ورنہ فرضِ انسانی کا لحاظ کروں تو میرے جیسی کیفیت کے آدمی کے لئے شادی کرنا گناہ ہے میری ناکامی کا راز میری بلندئ فکر میں مضمر ہے ؎

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

میں اس یکساں سکون سے تنگ آ گیا ہوں میری زندگی میں کوئی بزرگی نہیں۔ اسلئے یہ زندگی میرے ناقابلِ تحمل تخیل پر ایک سنگ گراں ہے جو مجھے فکرِ پرواز میں قعرِ مذلت کی طرف گرائے جا رہی ہے اگر مجھے دنیاوی ثروت نہیں ملی تھی کیونکہ میں معاملاتِ عالم سمجھنے میں اُمّی ہوں۔ تو کاش میں شاعر ہی ہوتا اس لئے نہیں کہ دنیا میں شاعری سے شہرت و عزت حاصل کرتا بلکہ ذوق سخن مجھے ہمجنسوں کی دریوزہ گری سے مستغنی کر دیتا آہ میں سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہوں مجھے جاہ طلبی کا مرض نہیں لیکن احتیاجِ مجلسی نے میری غیرت کو تہس نہس کر دیا ہے میں اب تک ایسے شخص کی تلاش میں رہا ہوں جو مجھے تمام افکار سے رہائی دلا کر کامل طور پر اپنے اندر جذب کر لے لیکن آہ ایسے تعلق کا پیدا ہونا دوسرے کی نگاہِ کرم پر منحصر ہے۔ میں جو ہر احتیاج پر صبر کر سکتا ہوں۔ ترکِ کل کا دعویدار ہوں۔ اپنے ہمجنس کی انمول محبت کو ترک نہیں کر سکتا۔ جہاں دوسری چیزیں آرزو اور محنت سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ جنس گرامی حدتِ آرزو اور شدتِ جستجو سے ہاتھ نہیں لگتی۔ آہ مجھے ردِ سوال کی تاب نہیں۔ جہاں مجھے خوفِ یاس ہو وہاں میں طلبِ آرزو سے اپنی بے حرمتی کیوں کراؤں۔ لیکن میں تو اس تنہائی کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ خوفِ ناقبولی مجھے اپنے تئیں وقفِ ارمان کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا لیکن جو تکلیف مجھے سعی لاحاصل سے ہوتی ہے۔ اس کا علاج سوائے کنج تنہائی کی مشقِ سخن کے اور کسی طرح ممکن بھی تو نہیں۔ شاعری الٰہی دین ہے کسبی فن تو نہیں جو دماغ سوزی سے غم و اندوہ کے نقشے نظم میں کھینچ کر اپنے دل کو تسکین دیتا رہوں۔ زائیدۂ خیالِ یار کی صفات بے ترتیب نثر میں ظاہر نہیں ہو سکتی وہ تو خود ایک شعر ہے نثر کا لباس تو غلیظ ابر کی طرح حجلۂ نورِ ماہتاب کی قطعِ ضیا کا باعث ہوگا ✦

کاش میں بڑا اچھا مقرر ہوتا قوم کے جذبات کو اپنی دھواں دھار تقریروں سے اُبھارتا اس حالت میں فلاحِ قومی کو زندگی کا نصب العین قرار دیکر تمام جذبات

اس خدمت پر قربان کر دیتا میرے الفاظ شعلہ فشاں ہوتے میرے ہم ملت میری پیروی سے اوجِ ترقی پر پہنچتے لیکن آہ یہ تو بہت بلند خواہش ہے۔ مَیں تو غبارِ راہ کی طرح ٹھکرایا جا کر ذرا اُٹھتا بھی ہوں تو پھر اوندھے مُنہ گر پڑنے کے لئے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ حیوانوں کی طرح سوائے خواب و خور کے اور کوئی کام مجھ سے بنی نوع کے فایدے کیلئے بن نہیں پڑتا خیال ہزاروں ہیں لیکن قوتِ عمل سلب ہو چکی ہے کاش کہ مَیں ارفع زندگیوں سے واقف ہی نہ ہوتا۔ تاکہ مجھے احساسِ نااہلی اسقدر تکلیف نہ دیتا۔

جب مجھے سب طرف سے یاس خیز مناظر حواس باختہ کر دیتے ہیں تو مَیں مذہب میں پناہ لینا چاہتا ہوں لیکن یہاں بھی میں خود غرضی کو ترک کر کے نہیں آتا۔ مَیں نے بہت سی آرزوئیں پیدا کیں اور ان کے لئے دُعائیں بھی بہت تضرع سے مانگیں۔ لیکن مدعا کے حاصل ہونے پر معلوم ہُوا کہ میری دُعائیں اصلِ مقصد کی بلندی سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں مَیں نے خدا کی حکمتِ بالغہ پر بھروسہ نہ رکھ کر اپنے لئے وہ خواہشات پیدا کیں جن کے حصول کے بعد انکے مضرت رساں ہونیکا علم ہُوا۔ چونکہ میری عبادت بھی خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے اِسلئے مجھے اپنے اعمال سے خدا کے حضور بھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ مَیں خودکشی کو محض بزدلانہ فعل نہیں سمجھتا۔ جس شخص کو میری طرح دُنیا میں اطمینان حاصل نہیں اِس کا آخری علاج موت ہے۔

مجھے مرنے سے پہلے مرحوم کی آخری وصیّت کو پُورا کرنا ہے اگرچہ ہنگام شادی میرے لئے پیغام موت ہو گا لیکن مَیں اپنے تئیں ان کی دم والپسین کی خواہش پر قربان کر دونگا میری پیش نظر بیوی خیال اور اخلاق میں مجھ سے بہت بزرگ ہے میری اور اس کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ آہ جیسے مَیں ہمیشہ جاہل بیوی سے عقدِ پیوند کا مخالف رہا ہوں۔ ایسے ہی میں ایک بڑی پڑھی لکھی فاضلہ خاتون کو ایک

نااہل مرد کے ہاتھوں بکتا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تو نامنقطع مصائب سے مانوس ہو چکا ہوں لیکن میری مظلوم رفیقۂ حیات میرے ساتھ زندگی کی صعوبتیں کیونکر برداشت کریگی۔ اب تو میں ایک جاہل مطلق عورت کو ایک روشن خیال بیوی پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ جاہل بیوی کو تو میری کوتاہیوں کا احساس ہی نہ ہوگا لیکن وہ معصومہ جو علم بھی رکھتی ہے اور ذکی الحس بھی ہے میری جنون آفرین زندگی سے کیا راحت حاصل کر سکتی ہے۔
مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری موت بہت قریب ہے مجھے ایک بیماری لاحق ہونے والی ہے جس کا نام ہے "بیوی" آہ بیوی کا مریض جانبر نہیں ہو سکتا۔ دیکھو یہ شادی نہیں غم ہے غم۔ درد دل رکھتے ہو تو آؤ اور اس رنج میں میرے شریک ہو۔ خاکسار عزادار"

اس خط کے ایک ماہ بعد عزادار کے جائے قیام پر گیا تو معلوم ہوا کہ غریب چار روز ہوئے۔ بستر پر سے صبح کے وقت مردہ پایا گیا۔ کسی نے میرے کان میں یہ بھی کہا کہ عزادار حسین پر زہر خوری کا گمان ہے لیکن ڈاکٹری بیان سے پایا جاتا ہے۔ کہ حرکتِ قلب کے رُک جانے سے دم نکل گیا۔ ہائے عزادار تیری موت اگر حرکتِ قلب کے رُک جانے سے بھی ہوئی تو بھی خودکشی سے کم نہیں تُو نے اپنی موت آپ مول لی۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اس شہید خیال کے لئے دعاء مغفرت فرمائیں۔ اگرچہ دُنیا میں اُسے اطمینان میسر نہیں ہوا لیکن اس کی رُوح کو ابدالآباد تک کے لئے سکون حاصل ہو۔ اللہ تعالٰی اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین ثم آمین +

فرقت نصیب
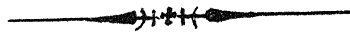
ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

وہ مرحوم آج سے تیس سال پیشتر کشمیر کے مردم خیز خطہ سے پیدا ہوا۔ اپنے والدین کا سب سے پہلا بچہ تھا۔ ہزار چاؤ چونچلوں سے پرورش پائی۔ ایام طفولیت ہی سے ماں باپ کے لاڈ پیار نے اُسے نازک مزاج بنا دیا تھا چنانچہ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہمیشہ اپنی ہی بات دوسروں سے منوا کر چھوڑی۔ لیکن جو کوشش اور بحث اُسے اپنی رائے کو صائب قرار دینے میں کرنی پڑتی تھی وہ اس کے سن و سال اور دماغی اور ذہنی طاقت سے فزوں تر ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ مرحوم بہت ذکی و طباع تھا۔ مگر چونکہ وہ اپنے قوائے ذہنی سے ضرورت سے زیادہ کام لینے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس لئے بلحاظ عمر اپنی وسعت سے بڑھ کر اہم مسائل پر طبع آزمائی کرنے میں اکثر ناکام ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوستوں میں وہ کج بحث مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ اپنی تمام عمر میں کبھی دلائل میں عاجز ہوا ہو ہاں بچپن ہی سے محاربات علمی میں ورزش دماغ کرتے کرتے وہ ہر مذہبی مجلسی و تمدنی دنگل میں وقف پیکار ہونے کے لئے تیار رہا کرتا تھا۔ اسکی پیدائش ایسے گھرانے میں ہوئی تھی۔ جہاں اُسے سن شعور ہی سے علمی مشاغل میں اپنے تئیں فنا کر دینے کی تعلیم ملنی شروع ہو گئی۔ مذہبی تعلیم تو اُس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کیونکہ اس کے چچا نے جو ہندوستان کے معرکۃ الآرا علماء

میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بوجہ صلبی اولاد سے محروم ہونے کے اسے اپنا متبنہ قرار دیا تھا۔ ابھی وہ گھٹنوں ہی چلنا سیکھا تھا کہ اُس کے رضائی متبنّی باپ نے ہر وقت اُسے اپنے ساتھ کتبخانہ میں رکھنا پسند کیا۔ چنانچہ اس جان ہارنے جب آنکھیں کھولیں تو پہلی نگاہ حدیث وفقہ کی گریبان گیر صد زبان کتابوں پر ہی پڑی۔ اب وہ بجائے کھلونوں کے کتابوں کے شیرازے توڑ پھوڑ کر دل خوش کیا کرتا تھا۔

میری اس کی مدت کی ملاقات تھی۔ اگرچہ ہماری شناسائی ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہوکر گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ تقریب تعارف بجائے خوشگوار ہونے کے جانبین کے لئے کاوشِ قلبی کا باعث ہوئی تھی۔ میں بھی اگرچہ مذہبی مجنون تو نہیں ہوں لیکن شیعہ گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث بچپن ہی سے اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت مذہب سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوئے سُنی شیعہ کے مابین وجہ پرخاش سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ مرحوم تو جو کچھ اپنے چچا سے علمی مجالس کے دوران میں سُنا کرتا تھا۔ جب تک اپنے ہم جولیوں کو سُنا کر اپنا مرید نہ کرلے شاعر جیسے القائی پیغام بر کی طرح بے قرار رہا کرتا تھا۔ آج کل کے مسلمان بچے چونکہ خود مذہب سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس لئے مرحوم کے طریق تبلیغ سے متاثر ومرعوب ہو کر اس کے حلقہ بگوش ہوجاتے تھے۔ اس طرح اُس نے بچپن ہی سے اپنا حلقۂ ارادت وسیع کر لیا تھا۔ جونہی اس کے کان میں بھنک پڑی کہ اس کے زیرِ دیوار ایک رافضی لڑکا فروکش ہوا ہے۔ جو محرم کے میلے میں حصولِ انبساط کو گناہ سمجھتے ہوئے ہنگامۂ عزا میں شریک ہو کر نشرِ بدعت کا باعث ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً اپنے حلقہ بگوشوں کی فوج لے کر مجھے راہِ راست پر لانے کے لئے

میرے مکان پر تعینات ہوگیا۔ آہ یہ ابتدائی مخالفت اس جوانا مرگ نے آخر دم تک قائم رکھی۔ لیکن مذہبی بحث اُسے معمولی آشنا سے مخلص دوست بنا گئی۔ اگرچہ دوستی کی خاطر اصولی مخالفت چھوڑنا وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اس پر بھی آج کل کی سوسائٹی میں اس سے بڑھ کر فداکار دوست میسّر آنا محال ہے۔

یہ مخالفت اس کی مجھ ہی سے نہ تھی۔ بلکہ بالغ العقل ہونے پر وہ ایک زمانے تک اپنی تحقیق کے بل پر اپنے علامۂ روزگار چچا سے بھی منحرف رہ چکا تھا۔ وہ مذہب میں بزرگوں کی اندھی تقلید گناہ سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ دل میں شبہ پیدا ہوتے ہی اسنے اپنے معلم ایمان چچا کی مخالفت شروع کردی تھی۔ وہ اس کے ابتلا کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے چچا کے حربوں سے واقف ہوچکا تھا۔ مذہبی نبرد آزمائی میں بھلا وہ جانچے تُلے ہتھیاروں سے کب عاجز آسکتا تھا۔ ایک زمانہ جانتا ہے کہ اس نے حریف بنکر اپنے چچا کے کیسے دانت کھٹے کئے تھے۔ چند سال کے تقلید شکن معرکوں کے بعد مخزنِ احادیث سے جب تمام سامان حرب جانبین کے ہاتھوں صرفِ پیکار ہوچکا تو نہ معلوم کس اسلوب پر مخاصمت مذہبی کا خاتمہ ہوا۔ اب وہ پھر مباحثوں میں اپنے چچا کا دست و بازو ہوگیا تھا۔ آہ عین اس وقت جبکہ اس کے چچا نے جان توڑ کوشش سے اُسے اسلامی مبلغ اور اپنا نائب و وارث بنا لیا تھا۔ موت کے وقت ناشناس وار نے اس کے چچا کو روحانی فرزند اور اس کے دوستوں کو جاں نثار یار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کردیا۔

مجھے خوف ہے کہ یہ سطور پڑھنے والے میرے بیان سے کہیں مرحوم کو کٹھ مُلانہ سمجھ بیٹھیں۔ اللہ اللہ یہ تو محض اسکا مذہبی وجدان تھا۔ ورنہ وہ زندگی کے اور کسی شعبہ میں بھی ناکام نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے مذہب سے حسن

تسناس دل پر ایک آہنی غلاف چڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے مذہبی آدمی خواہ لاکھ فنا فی اللہ ہو جائے لیکن اللہ کے بندوں سے مانوس نہیں ہو سکتا۔ اکثر حالتوں میں یہ درست بھی ہوتا ہے لیکن مرحوم کی زندگی پر فقط ایک لیبل مذہب یا عشق یا دنیا فہمی کا نہیں لگا سکتے۔ وہ تو ہر جولانگہ میں اپنے ہمجولیوں سے پیش پیش ہی نظر آتا تھا۔ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا۔ نہایت جانفشانی اور دیانت سے اپنے تمام قوائے جسمانی و ذہنی اس کے سرانجام میں صرف کر دیتا تھا۔ اس عمر میں کہ بچّہ اپنی جان سے زیادہ کسی چیز سے محبّت کرنا نہیں جانتا کیونکہ مشاہدے سے دیکھ لو کم سن معصوم بچے سے بڑھ کر خود غرض کسی کو نہ پاؤ گے۔ (بچّے کے اندیشے و افکار محض اپنی جان کے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ تمام دُنیا کو شخصی مفاد کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور ہر چیز سے بحدِ امکان خدمت لینا چاہتا ہے) وہ مرحوم محبّت کی جانسپاریوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کے تمام دوستی کے تعلقات ابتدائے شعور سے جذبۂ عشق سے نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ اس نے کبھی کسی کام میں بے دلی یا بے توجہی نہیں دکھائی۔ لیکن سب سے زیادہ انہماک اس سے افکارِ عاشقانہ میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ آہ مرحوم مجھ سے ہر ملاقات پر وقفۂ فرقت کی تمام راز کی باتیں کر جایا کرتا تھا۔ اس کی زندگی کی مخفی کیفیات یوں تو ہر دوست پر عیاں تھیں۔ لیکن مجھے تو وہ کوشش سے اپنے تمام راز بتا جاتا تھا۔ بات کرتے وقت اسکی کوشش ہوتی تھی۔ کہ وہ تمام کیفیاتِ قلبی کو اسی طرح میرے ذہن نشین کرے۔ جس طرح وہ خود محسوس کرتا تھا۔ اسے مجھ پر غلط فہمی کا کبھی گمان نہیں ہؤا۔ اس لئے وہ نہاں در نہاں رازوں کو بھی مجھ سے کہتے نہیں جھجکتا

تھا۔ چنانچہ ایک روز بڑے یاس کے لہجے میں کہنے لگا "کہ ہندوستان میں رہ کر کامیابِ عشق ہونا ناممکن ہے۔"

میں اُسکا فلسفہ حُب سُننے کے لئے ہمیشہ تیار رہا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ قطعی فیصلہ مرحوم جیسے پُختہ کار عاشق سے سُنکر مجھے تعجب کے ساتھ اسکے وعظِ عشق سُننے کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ اور میں اُس سے اِس امید سوز فقرے کی وضاحت کا خواستگار ہُوا۔ مرحوم نے بڑے جوش سے اپنی تقریر یوں جاری رکھی :۔

"دیکھو قدرت کی تمام اشیاء میں جوہر آزادی فطری طور پر مضمر پاؤ گے بے جان و جاندار چیزیں سب کی سب اپنے وجودِ امتیازی کو نمائش گاہِ عالم میں تماشائے نظر کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ چہ جائیکہ کوئی ذی روح ہستی۔ بیرونی اثر کے ماتحت اپنی آزادی سے برضائے قلبی دست بردار ہو جائے۔ ہوسِ آزادی کائنات عالم کے ذرّے ذرّے میں جان بخش روح کی طرح سمائی ہوئی ہے۔ جبراً کسی شے سے اس کی قوتِ اختیار چھین لو پھر دیکھو وہ کیونکر زندہ رہ سکتی ہے۔ پاداشِ جرم میں اگر کسی شخص کو سپردِ زنداں کیا جائے۔ تو اس میں بتدریج سرکشی کا قدرتی جذبہ مر جاتا ہے اور اب اسکی زندگی میں خواص فطری کے تعطل کے باعث عیشِ حیات باقی نہیں رہتا۔ کیا اسے زندگی کہتے ہو؟ جو آپ کے نکتہ خیال سے مجرم کی زندگی میں داغِ بدعملی تھا۔ وہی میرے نزدیک اس کے لئے نشانِ زیست تھا۔ جو آپ کی اخلاقی سوہان کی نقش بردار کاہش سے مٹا دیا گیا۔ جہاں آپکی "تعزیراتِ اخلاق" ڈاکو کی آزادی چھین کر ملک میں امن بخشنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ وہاں ایک اور بے بس فرتے کو حبسِ دوام کا فتوے

لگا کر قوم کے بڑھتے ہوئے تمدن پر سکونِ مطلق کی مہر لگا دیتی ہے صنفِ
نازک کے اس بیجا حبس کا اثر سب سے پہلے مقامی لٹریچر میں نمایاں ہوتا
ہے۔ عربی شاعری میں معشوقہ عرب ہمیشہ عورت ہی رہی ہے لیکن مجھے حیرت
ہوتی تھی کہ فارسی اور اُردو نظم میں خلافِ فطرت بجائے عورت کے "طفلِ پریزاد"
کو معشوق کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے نازک خیال شعرا کی نگاہ میں عورت
کا عدیم المثال حُسن کیوں نہیں جچتا۔ یہ عقدہ اب حل ہؤا ہے۔ کیونکہ عربوں نے
عورت کی آزادی اپنی وحشت کی قربان گاہ پر نہیں چڑھنے دی۔ وہاں ہمیشہ
کی طرح اب بھی جانِ حیا عورت ستر پوش عورت حجاب فطری میں محفوظ۔
مردوں کے درمیان ملی جلی رہتی ہے اور اس آزاد خطہ کے خوش نصیب
مردوں کی بالیدگیٔ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے
ملک میں عورت کو بُری چیز کی طرح چھپایا جاتا ہے (میرا شانہ ہلاکر) سنتے
ہو۔ عورت تو ایک گل اندازبیل ہے۔ جو گرمی اور روشنی میں پھیلتی اور
پھولتی پھلتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت مرد کی حدت الفت سے بچا بچا
کر چاردیواری میں قید کی جاتی ہے۔ وہ نگہت آفرین پھول تاریک گوشوں
میں مرجھا کر رہجاتا ہے اور مرد کی اسکو ہوا تک نہیں چھوتی محروم القسمت
مرد کی نگاہ حق انتخاب سے محروم کی جاتی ہے۔ اُسے آرزو ہوتی ہے۔
سیر گلشن کی تاکہ وہ اپنی خواہش سے چمپا۔ موتیا۔ چنبیلی۔ شبو۔ نرگس۔ لالہ
وغیرہ میں سے سونگھ سونگھ کر بہترین پھول اپنے لئے منتخب کرے لیکن
آہ زبردستی اس کے چاک گریباں میں ارنڈ کا پھول ٹھونس دیا جاتا ہے
اور ساتھ ہی ہدایت ہوتی ہے کہ سعادت اسی میں ہے کہ بزرگوں کی دی
ہوئی چیز کو بطیب خاطر قبول کرو۔ مجبوراً غریب کو بطور تبرک اس تحفہ ارمان

سوز کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ بزرگوں کا ہدیہ اس کے لئے منہ کی رسولی ہو جاتا ہے۔ جو نہ کاٹے بن پڑے نہ رکھے۔ آخر اسکا حسن شناس دل قانونِ جبر کے ماتحت حسنِ فطری کھو بیٹھتا ہے اور اب اُسے گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی شاعر کی نگاہ عورت کے حُسنِ مستور سے ناآشنا ہوتی ہے۔ وہ عورت کی دلفریبیوں کی اپنے خیال میں جگہ نہ پاکر شعر میں ذکر تک نہیں کرتا۔ لیکن محبت کا جذبہ تو ایک مطمح نظر کا متلاشی ہوتا ہے۔ آخر شاعر کو اپنے گردو پیش جو چیز نازک و معصوم نظر آتی ہے اسی کو بطور معشوق خطاب کرتا ہے۔ پس بخلاف عربی شاعری کے اُردو میں ادنےٰ قافیہ گو سے لیکر اکمل شاعر تک اپنی حسرتوں کے گورستان کا مجاور بن کر نوحۂ فراق کو بجائے "حور" کے "بچۂ حور" سے مزین کرتا ہے۔

مرحوم میں یہ نقص کھو یا خیالات کا بُحران وہ اپنے مدعا کو مختصر جملہ میں ادا کرنے سے قاصر تھا اور اس کے تمام دوستوں میں فقط میں ہی اس کے طویل وعظ کا متحمل ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مرحوم کے دل میں جو خیال پیدا ہو وہ اُسے مبہم سے الفاظ میں ادا کرکے خاموش ہو رہے۔ آہ اب تو سب دوست اُس کی طوُل کلامی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

لیکن اس روز کے خطبۂ بلیغ کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کے دادا جان نے مصلحت وقت کے ماتحت محلہ میں اپنا اعتبار بڑھانے اور ہمسایوں سے رابطہ اتحاد قائم کرنے کے جنون میں مرحوم کو بِلا دیکھے بھالے ایک بدمزاج لڑکی سے بیاہ دیا تھا۔ اور اس ارنڈ کے پھول سے مرحوم کے چاکِ گریبان میں اندازۂ شعری سے زیادہ رخنہ پڑ گیا تھا۔ لیکن مرحوم سے خلاف مزاج کوئی بات منوانا بڑی غلطی تھی۔ چند ہی روز گذرنے پر مرحوم نے جھنجلا کر ازدواج کا

پھول" نوچ کر پھینک دیا از سرِنو زینتِ چاک کے لئے سرگرداں پھرنے لگا۔
قدرت نے محبت کا جذبہ عطا کرتے ہوئے بڑی دریا دلی سے کام لیا تھا۔ دوستوں پر وہ سو جان سے قربان تھا۔ جب دوست اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے تھے تو وہ فراست سے فوراً تاڑ جاتا تھا مگر متواضع اس قدر تھا کہ محض اس خیال سے کہ دوست اپنی کوشش میں ناکام ہو کر کھسیانے نہ ہو جائیں۔ اُن پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ ابھی نوعمر ہی تھا کہ ایک مرتبہ اس کے بچپن کا دوست محمود اس کے ہاں مہماں آیا۔ پانچ چھ سال کی مفارقت کے بعد ملاقات میں غیر معمولی خوشی ہونا قدرتی تھی۔
ان دنوں اسکا ہم مکتب چالاک و ستھری بلاغت اللہ اکثر اس کے ساتھ رہا کرتا تھا محمود کے چلے جانے پر بلاغت اللہ نے اُسے خط لکھا جس میں باوجود نومشق ہونے کے جوہر بلاغت بھرپور دکھائے۔ مرحوم نے بھی وہ خط پڑھا۔ اُسے اپنی پھیکی سیٹھی عبارت کے مقابلہ میں ایسی لچھے دار تحریر دیکھ کر بہت طیش آیا۔ اُس نے فوراً حسد رقابت سے مجبور ہو کر شریر بلاغت اللہ کو اپنے کمرے سے نکال دیا۔ اور کمرے کو "ہوا بند" کر کے خط لکھنا شروع کیا۔ اس روز مکمل بارہ گھنٹے کی سعیٔ بلیغ سے سنے وہ خط ختم کیا۔ مجھے دکھا کر دا دچاہی بلاغت اللہ نے بھی خط پڑھا اور بہت تعریف کی۔ لیکن ستم ظریف بلاغت اقرار شکست کرنا خلاف شان سمجھ کر کہنے لگا "میرے مقابلے پر اُتر آئے ہو۔ جو کچھ میں کر سکتا ہوں تم سے کبھی نہیں ہوگا" مرحوم نے ہاتھ سینے پر مار کر کہا "جو آپ کریں گے انشاء اللہ میں اُس سے بڑھ کر کروں گا"
بلاغت اللہ نے جھٹ جیب سے چاقو نکالکر اُسکی تیز نوک سے اپنے بازو

کو چھیلنا شروع کیا۔ چاقو کے لگتے ہی بلاغت کے بازو سے شلالۂ خون جاری ہو گیا۔ اور اُس نے اس خون میں پن ڈبو کر محمود کو خط لکھنا شروع کیا۔ مرحوم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بلاغت اللہ کے اس وحشی پن کا تماشا کر رہا تھا۔ بلاغت نے جب خط ختم کر لیا۔ تو ہنس کر کہنے لگا "بتاؤ میرا مقابلہ کر سکتے ہو" مرحوم نے فوراً اپنا محنت سے لکھا خط چاک کر دیا اور گلے کی رگیں پھُلا کر غصے میں خوب اچھلا کودا۔ اور غضب ناک ہو کر کہنے لگا "یہ شرک ہے شرک! حیف ہے تمہاری مسلمانی پر۔ میرے مولا کو ایسی مکروہات قبول نہیں"۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مرحوم دوستوں کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر مذہب کی پناہ لیا کرتا تھا۔ لیکن وہ اندھا دھند تقلید کا مخالف تھا۔ اس کے مذہبی عقاید بھی انتخابی ہُوا کرتے تھے۔ اُسنے مذہبی وجدان کے ماتحت کبھی اس قدر جوش ظاہر نہیں کیا۔ جیسا کہ وہ عشق افروز کیفیات سے متاثر ہو کر مجنوں ہو جایا کرتا تھا۔ مجبورِ وفا ہو کر وہ جو کچھ کر گذرتا تھا۔ شائد قیس و فرہاد کو بھی کرنے میں تامل ہو۔ ایک زمانے میں وہ تمام دوستوں سے چھپا چھپا پھرا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ تمام دوستوں سے بیزاری ظاہر کرتا تھا۔ اور اُسنے ہم سب کو شریر و مفتن قرار دے کر ہم سے پہلو تہی اختیار کر لی تھی۔ لیکن تنہائی مطلق تو اُسے موت کے برابر تھی۔ اس لئے وہ دل بہلانے کو اکثر یوسف کے مکان پر چلا جاتا تھا۔ یوسف یوں تو ہم سب کا ہی دوست تھا۔ لیکن مرحوم کو اس سے خاص ارادت تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد سُنا کہ مرحوم نے گھر میں طریق شادی پر مسلسل لکچر دے کر تمام بزرگوں کو اپنی پھوپی زاد بہن کا عقد یوسف سے کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ ہم سب کو

حیرت تھی۔ کہ اپنے کنبے میں رشتے چھوڑ کر غیروں میں لڑکی کیوں دی کہ اتنے میں یوسف کی سگی بہن سے مرحوم کی شادی کے اعلان نے اس معمّہ کو حل کر دیا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ مجھے ملا۔ اور مجنونانہ انداز میں مجھے کھینچتا ہوا دریا کے کنارے پر لے گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بات کرنے کی کوشش میں اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے آبشار مسرّت بن بن کر پھوٹے پڑتے تھے۔

طویل گفتگو چھیڑنے کی تمہید میں ہمیشہ کی طرح کھانس کھنکار کے کہنے لگا۔ "تم ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ کہ ہندوستان میں دلپسند بیوی ملنی دشوار ہے۔ دیکھو تو اللہ نے اس دشواری کو مجھ پر کیسا آسان کر دیا تم نے بہتیرا سر پٹکا لیکن کوئی طریقِ انتخاب پیدا نہ کر سکے۔ آخر میں نے اس مشکل کو حل کر لیا۔ تم جانتے ہو یوسف سے مجھے کسقدر تعلق ہے میں نے کئی دوست کھو کر اسے پایا ہے مجھے تو وہ چھوٹے بھائی یا بیٹے کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن جس قدر وہ مجھے عزیز ہوتا جاتا تھا۔ اسی قدر اندیشۂ مفارقت زیادہ تنگ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس دُھن میں آپ سب سے ملنا کم کر دیا تھا۔ میں شب و روز تدابیر سوچتا تھا کہ یا اللہ کوئی ایسی تجویز بن پڑے۔ جو میری اور یوسف کی دوستی پر مداومت کی مُہر لگ جائے۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے بالقائے ربانی وہ چیز نکالی۔ جو تمہارے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھ سکتی۔ دیکھو یہ بات تمہارے کانوں تک ہی رہنی چاہیئے۔ میری جگ ہنسائی نہ کرانا" اب اس کے لہجہ میں ایک افتادِ مسرّت اور اسکی آواز میں ایک لرزۂ گریاں پیدا ہو چلا تھا۔

فرطِ انبساط سے الفاظ اس کے حلق سے رک رک کر نکلتے تھے ۔ وہ باتیں کرتا ہوا بالکل میرے مقابل آ گیا۔ اور اس کے تنفس کے ساتھ لعابِ دہن کے چھینٹے اُڑا کر میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ یہ کیفیت اسکی انتہائے جوش میں ہوا کرتی تھی) میں نے بڑے اینچ پینچ لڑا کر اپنی پھوپی زاد کو یوسف کے ساتھ بیاہ دیا۔ یہ ایسا محکم رشتہ ہے کہ خواہ یوسف کہیں ہو اسکا دل ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوگا۔ آلام روزگار اور ہماری افکار اسے ہمارے گھر سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اس رشتہ کو اور محکم کرنے کے لئے میں نے اپنی پھوپی زاد کو یوسف کی ہمشیرہ کا پیام اپنے لئے چاہنے کے واسطے مستعد کیا۔ آہ یہ بڑی عظیم الشان کامیابی ہے آخر میری اور ہمشیرہ کی سازش کارگر ہوئی اور اب وہ یوسف جو کبھی فقط دوست ہونے کی حیثیت میں خفیف جنبش تقدیر سے جدا ہونے کے محل میں رہتا تھا۔ اب بہنوئی اور سالہ ہونے کی حیثیت میں دو کڑی زنجیروں سے جکڑا جا کر ہمیشہ کے لئے میرے ساتھ پیوستہ ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی اولاد اور میری اولاد میں خونی اتحاد کا ناقابل گسل رشتہ جاری رہیگا۔ اسکا اور میرا خون آیندہ نسلوں کی رگ و پے میں مشترک بہیگا۔ خدا کے فضل سے میری بیوی عین میرے مزاج کے مطابق ہے۔ اِسے اتفاقی امر نہ سمجھو۔ بلکہ مجھے پہلے سے یقین تھا کہ وہ میری مرضی کے مطابق نکلے گی۔ کیونکہ ہندوستان کے شدید رسم پردہ کے ہوتے ہوئے ہم کوئی طریقِ انتخاب تو رائج کر ہی نہیں سکتے البتہ میری اَن دیکھی بیوی کی طبیعت کی صلاحیت کا ضامن فقط اُسکا بھائی یوسف تھا۔ اب میں اپنی بیوی میں یوسف کی تصویر پاتا ہوں میری آنکھیں پیاری صورت کو دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتی ہیں۔ تو میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں

پھر بھی فضا کی تاریکی میں اسکا درخشندہ چہرہ میرے مقابل ہوتا ہے۔" مرحوم کا فلسفۂ انتخاب پر لکچر سن کر میں بھی اس خیال سے بہت خوش ہوا۔ کہ شکر ہے "ارنڈ کے پھول" کے بجائے چاکِ گریبان کو "نرگس" نے زینت بخشی اگرچہ یہ محض اتفاقی امر تھا۔ ورنہ ہندوستان میں کوئی صحیح طریق انتخاب عمل میں نہیں آسکتا۔

مرحوم کے مزاج میں تلون بھی حد درجہ کا تھا اُس نے کبھی ایک کام کو عرصے تک لگ کر نہیں کیا۔ کیونکہ جب وہ ایک ہنر میں تکمیل کے قریب پہنچتا تھا۔ تو اس کی توجہ کسی بیرونی حادثہ کے باعث دوسری طرف منعطف ہو جاتی تھی معمولی اشغال سے گذر کر اُسنے کبھی دوستی کے شغف کامل اور عشق کی پختہ کاریوں میں بھی استقلال و ثبات نہیں دکھایا اس پر بھی وہ مخلص دوستوں اور نو بہار موسمی مطلوبوں کے تغافل اور بے وفائی کا شاکی ہوا کرتا تھا۔ ہم سب انتظار میں تھے کہ دیکھیں اس نرگس لالہ یعنے بیوی و سالہ کی محبت سے یہ بھنور اصفت ہرجگ زود پشیمان عاشق کب سیر ہوتا ہے کہ اچانک موت کے فیصلہ کن وار نے مرحوم کے نادر سوانح کا یکسر خاتمہ کر دیا۔

سکول میں اُسنے بہت کم تعلیم پائی تھی۔ کیونکہ بچپن ہی کے بحث مباحثوں سے اثر پذیر ہو کر اسکا دل اپنے چچا کے عقائد سے منحرف ہو کر مخالفین کی تلقین کی طرف زیادہ پسیجتا تھا۔ پس چچا نے اس خوف سے کہ مبادا انگریزی سکول کی آزادی میں بچہ مذہب سے بھی آزاد ہو جائے۔ اُسے مدرسہ سے علیحدہ کر کے اپنے زیر سایہ حدیث و فقہ کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس دوران میں مرحوم اکثر مرتبہ نوشاہیوں۔ قدموں اور بیساکھی

کے میلوں پر خود لا الہ اللہ اللہ محمد رسول اللہ کا علم اُٹھائے ہوئے عیسائیوں کے مقابل دیہاتیوں کے جم غفیر میں تبلیغ اسلام کرتا دیکھا گیا ہے لیکن اس کے دور اندیش دادا نے اس خیال سے کہ بڑا ہو کر کہیں مرحوم بھی وعظ فروش مولوی بن کر گھر بار سے بالکل بے خبر نہ ہو جائے۔ اسے چچا کے درس سے علیحدہ کر کے زمانہ کی احتیاج کے مطابق ایک بڑی سی دکان وسط شہر میں کھولدی۔ حیرت ہے کہ اسلامی مبلغ قبلہ وکعبہ کے ایک اشارے سے اچھا خاصا جھگڑالو سوداگر کیونکر بن گیا۔ ایسی قلب ماہیت دیکھ کر سب دوست حیران تھے۔ اُس نے تین چار سال تک تدابیر لڑا کر خوب سوداگری کی۔ اور شہر کے معتبر تاجروں میں شمار ہونے لگا کہ تقدیر نے پھر دھکا دیا۔

ایک نابالغ لڑکی بہلائے پھسلائے سے عیسائی ہوگئی۔ وارثوں نے عدالت میں نصرانی مشن کے خلاف چارہ جوئی کی۔ مرحوم کو ایسا مشغلہ خدا دے۔ فوراً دکان بند کر پادریوں کے خلاف بزور کلمۃ اللہ جہاد شروع کر دیا۔ اس وقت مرحوم کے سبزہ آغاز تھا۔ لیکن حجام کی حسن تدبیر سے چہرہ ہمیشہ صاف کرا کرتا تھا۔ اب اُس نے عملاً ونسکاً مسلمان ہونے کا تہیہ کر لیا۔ اور دکان بند کرتے ہی داڑھی چھوڑ دی۔ کہیں کہیں چھدری داڑھی نے چہرہ بدزیب کر دیا۔ لیکن غیرتِ اسلامی میں بناؤ سنگھار سے کیا تعلق! لڑکی والوں کو جس قدر امداد ممکن تھی دی۔ آخر مقدمہ وارثوں کے حق میں فیصلہ ہوا۔ لیکن مرحوم اس سانحہ سے ایسا متاثر ہوا۔ کہ دکان نیلام کر کے تعلیم نسواں میں اپنے تئیں قدمے۔ قلمے۔ درمے وقف کر دیا۔ آخر کئی سال کی کوشش سے شہر میں لڑکیوں کا مدرسہ

جاری کروا کے مشن سکول کی بھرتی نئے مدرسہ میں ڈالی مسلمان بچیوں کو عیسائی تعلیم سے بچانے میں گونہ کامیابی حاصل کر کے اس شغل کو بھی ترک کیا اور جو تجربہ لڑکیوں کے تعلیمی انتظام میں بہم پہنچایا تھا۔ اُس سے فائدہ اُٹھا کر تمام پنجاب کے ہر ایک شہر میں عیسائیوں کے طریق پر نوجوان مسلمانوں کی انجمنیں قائم کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ اس بات سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر شہر میں انجمن شبان المسلمین کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ تحریک پنجاب میں سب سے پہلے مرحوم اور اُس کے ہم خیال لوگوں میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ مرحوم نے ابتداءً پریزیڈنٹ اور کبھی فنانشل سکرٹری کبھی جنرل سکرٹری کبھی محاسب بن کر انجمن کی بنیاد کو محکم کیا۔ تین سال اس دُھن میں صرف کر کے شاندار انجمن کو امراء قوم کے سپرد کر کے خود پھر کسبِ معاش کے لئے کارخانہ جاری کیا۔ کُجا تعلیم نسواں کا منیجر۔ کجا شبان المسلمین کا سیکرٹری۔ اور کجا چمڑے کا تاجر یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آتی تھی۔ آخر اس نے خود اس کام کو خلافِ شان سمجھ کر ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی ٹھانی۔ ادبی رسالے اور کتنے کامیاب ہوئے ہیں۔ جو مرحوم کو فقط رسالے کی بدولت فارغ البالی نصیب ہوتی۔ لیکن اُس نے اپنی ناکامی کی وجہ اپنی خامئِ علم کو قرار دے کر از سر نو تحصیلِ عربی کی کوشش شروع کر دی۔ اور کولھو کے بیل کی طرح جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آٹھہرا۔ ایک سال تک بلا ناغہ عصر سے کچھ پہلے صحاح سِتّہ کا بوجھ اُٹھائے سارے شہر کو چیرتا ہوا علامۂ مقامی کے کاشانۂ نعمت کی جانب شوقِ تحصیل میں دوڑتا رہا۔ غالباً اب وہ اپنے چچا کی تعلیم اپنے مقاصد کے

مقابل ناکافی سمجھتا تھا۔ ورنہ اس کے تو گھر میں گنگا بہتی تھی۔ اتنی دُور جانے کی کیا حاجت تھی۔ اسکا چچا خود عالم متبحر تھا۔ اُسے ادق سے ادق مسائل سمجھا سکتا تھا۔ لیکن شاید یہاں بھی گھر کی مرغی دال برابر والی مثل صادق آتی ہو۔ آخر کمبخت بلاغت اللہ مرحوم کے حریف بلاغت نے کھوج نکال کر چھوڑا۔ معلوم ہؤا کہ مرحوم نے حضرتِ علامہ کے شاگرد رشید سے جو عربی میں نداق رکھتے ہوئے کالج میں بھی تعلیم پاتے تھے۔ ساز باز کر کے اُن سے انگریزی پڑھنے کی ٹیپس لڑائی ہے۔ حضرت علامہ کا درس تو دونوں اکٹھے لیا کرتے تھے اس کے بعد مرحوم انگریزی کا ڈھکوسلا کھڑا کر صحیفۂ عشق کی تلاوت کے شوق میں تکلف برطرف شاگرد رشید کے مکان کا طواف بھی لگے ہاتھوں کر لیا کرتا تھا اس دوران میں میں تو لاہور چلا آیا۔ لیکن میں نے بلاغت اللہ سے سُنا۔ کہ مرحوم نے علامہ کے شاگرد رشید کے قریبی رشتہ دار ہونے کا اعلان بھی دوستوں میں کر دیا ہے۔ اور حجت کے طور پر مرحوم نے اپنا اور اُسکا شجرۂ نسب بھی ملا دیکھا ہے۔ جو کہ شائد ساتویں یا نویں پُشت میں ایک دوسرے سے جا ملتا تھا۔ بھلا تعلق تلمذ اور اسپر اس قدر قریبی رشتہ داری! مرحوم جیسے قیس القلب انسان کو محبت پیدا نہ ہو تو تعجب ہے۔ چنانچہ بلاغت اللہ ہی نے مجھ سے ذکر کیا کہ اب مرحوم نے نئے دوست کے ساتھ ایسا پیمان وفا باندھا ہے کہ پرانے رشتے بوسیدہ ہو کر خود ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے یہ خط ملا :-

سیالکوٹ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۷ اپریل ۱۹۱۵ء — نحمدہٗ و نصلّی علے رسولہ الکریم

کرمفرمائے بندہ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ انسانی زندگی اور

اس کے ملحقہ صعوبات کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ تو آؤ اب غور کریں۔ ہر شے خواہ مادی ہو یا خیالی۔ بلکہ راسخ خیالات اور پختہ جذبات بھی اپنے اندر جوہر انحطاط رکھتے ہیں شہر بستے ہیں اور اُجڑتے ہیں۔ درخت پھل دیتے ہیں۔ اور سوکھ جاتے ہیں۔ انسان عالم سیاسی میں تہلکہ مچاتا ہوا غیر فانی معلوم ہوتا ہے لیکن مرجاتا ہے۔ قومیں بنتی ہیں اور بگڑ جاتی ہیں معرکۃ الآرا دشمنیاں خون آشام رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ یاریاں گرم جوشی کے ساتھ استوار ہوتی ہیں۔ اور سرد پڑ جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ فقط ایک موت کے قانونِ عالمگیر کے ماتحت ہوتا ہے ؂

تجربہ سے دیکھ لو۔ ہیجان عشق میں ثبات نہیں۔ چہ جائیکہ اخلاقی آشنائیاں دائمی ہوں۔ ہم تعلق محبت استوار کرتے وقت جانتے ہیں۔ کہ یہ خواہش کے مطابق مستقیم نہیں ہوگا۔ لیکن مستقبل کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہوئے لرزتے ہیں۔ کیونکہ کوشش و تحقیق سے جو حاصل ہوتا ہے وہ ہلاکت خیز حقیقت ہے۔ اس لئے ہم اپنی نادانی میں خوش رہنا چاہتے ہیں۔ جانتے تو سب کچھ ہیں۔ مگر جان بوجھ کر انجان بنے رہتے ہیں۔ دماغ پر زور ڈال کر انجام محبت کو نہیں سوچتے کیونکہ اس سوچنے میں یاس ہے اور یاس کے ساتھ مصیبت و جانکاہی جس کا آخری نتیجہ ہے موت!

محبت سے بڑھ کر پُرفریب جذبہ اور کوئی نہیں۔ پہلے ایک شخص کو دیکھتے ہیں تو نگاہ اول میں وہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر نہ ایسا کہ سینہ چیر کر اُسے اپنے اندر چھپالیں۔ چند روز باہمی میل جول سے اس کے ساتھ محبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُس وقت اگر یہ سوچا جائے کہ محبت کا

جواب صبر آزما تواضع پُر فریب مدارات پُر تصنع خُلق سے دیا جائیگا۔ تو آغازِ آشنائی ہی میں زیادہ ربط ضبط سے اجتناب کیا جائے۔ کیونکہ آ تیں گلے پڑی چھُٹنی مشکل ہیں۔ لیکن نہیں اِس وقت ضمیر پر عقل پروف غلاف چڑھا لیا جاتا ہے اور اس مبہم سی خواہش کے ساتھ (جسے ہم اُس وقت محبّت کی عریاں اصطلاح سے موسوم نہیں کر سکتے۔ مگر وہ خفیف سی لہر جو دل کی الحسِ ل کے رستے اعماق روح میں دوڑنا چاہتی ہے۔ ہوتی کچھ محبت کی خالہ زاد بہن ہی ہے) انجام تعلّق کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ البتہ دماغ میں ایک ہلکا سا یقین ضرور ہوتا ہے کہ اخلاص کا جواب اخلاص اور محبّت کا جواب محبت سے ملنا چاہئے جس وقت رشتۂ محبت بہت مضبوط ہو جائے۔ پھر بھی فریب نظر جاری رہتا ہے سعیٔ بلیغ سے بجائے محبوب کو پابند وفا کرنے کے خود زرّیں زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں۔ اب ہمارے لئے تو رہائی دشوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ذرا ٹھہر کر غور کیا جائے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نے اپنے تئیں خود دھوکا دیا۔ یعنے کبھی اس بات کو وہم میں بھی نہیں آنے دیا۔ کہ ہمارے شغف کا مآل کا انجام شکست آرزو ہوگا۔ اگر کبھی بے آبروئی بھی ہوئی تو غیرت پروفِ دل کو شادکام رکھنے کے لئے کھسیانی ہنسی ہنس دی اور دل کو یہی سمجھایا کہ یہ مغائرت عارضی ہے۔ سعیٔ پیہم کے دوران میں کبھی ایک لحظہ کے لئے نہیں، وچا کہ خارا شگافی کر کے بھی ہم اس سنگلاخ زمین میں جوئے محبّت رواں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس حقیقت کے انکشاف کے ساتھ خودکشی لازمی ہے۔ مگر ہر جانسوز واقعہ کیساتھ "ذوقِ حفظِ زندگی" گہری سوچ میں حائل ہو جاتا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ خراجِ الفت یہ مل سکتا ہے کہ آپ کو وفا پرور سمجھا جائے۔ مگر وہ قابل دید نا

جذبہ جو بجواب محبت وجود غیر کو آپکے لئے تڑپائے اور بے قرار رکھے۔ آپکی
مفارقت میں اُسے بھی ایک مبہم سی خواہشِ ملاقات ہر گھڑی مطالعہ کے
دوران میں تفریح کے اوقات میں نیند کے سرورِ بے ہوشی میں خواب کی
غفلتِ بیدار کے نہاں درنہاں پردوں میں سوتے اُٹھ کر احساسِ حیات
کی پہلی انگڑائی کے انتشار کے ساتھ پیدا ہو اور جاری رہے۔ آہ" کب
ممکن ہے! اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اور یوں اگر سر پڑ کر تعارف کرایا۔ تو
کس کام۔ خود ملاقات بڑھائی اگلے بھلے مانس نے پے درپے ناصیہ فرسائی
پر بتقاضائے شرافت خندہ پیشانی کا برتاؤ کیا۔ تو اُسکی خفیف سی مسکراہٹ
کو غنچۂ محبت کی شگفتگی سمجھے اسکی بے اعتنائی کو شانِ بلندی تصور کیا۔ کبھی
دل میں خیال نہیں آنے دیا کہ محبت کا جواب بجائے محبت کے کریمانہ
ہمدردی یا مرگ آور احسان پژوہی سے دیا جا رہا ہے تم چاہتے ہو خلاص مند
درد تمہیں پیش کیا جاتا ہے۔ مہذبانہ (منافقانہ) برتاؤ۔ کیا تمہاری تسلّی کے
لئے متواضع آدمیوں کی سی پر تصنع مدارات اصل محبت کا بدل ہو سکتی ہے
آہ ہم جانتے تو سب کچھ ہیں۔ مگر اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے لئے اس
ہلاکت خیز تصور کو کبھی دل میں جگہ نہیں دیتے۔

پس جس مقصد کی طلب میں ہم سرگرداں ہیں وہ تو سراب ہے سراب
اس میں صفت یہ ہے کہ ہمیشہ پیش نظر رہ کر سعی پیہم کا باعث ہوتا ہے
قطعی یاس سے بچائے رکھتا ہے۔ لیکن قابو میں کبھی نہیں آتا اور ہم
سب سراب کی ماہیت سے آگاہ ہونے کے باوجود یہی سمجھ رہے ہیں
کہ آگے بڑھے چلو۔ انشاءاللہ عنقریب آئے۔ کام آرزو [illegible]
لیکن یہ محض فریب آرزو ہے۔ بجائے اس کے آپ فریب نظر میں مبتلا

ہیں۔ اک جہانِ آرزو میں سرگرداں ہیں۔ اس سراب آفریں صحرائے یاس میں مقصد کی شادابی نہیں۔ یہاں ہر تپش اندوز دل کی پیاس موت سے بجھائی جائیگی +

یہ جو جملا فرمایا کرتے ہیں کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی میسر آتا ہے اسکا مطلب مجھے اب حل ہوا ہے۔ جب آدمی سخت سے سخت آزمائش میں پڑکر ہمت کو قائم رکھ کر زک کھاتا ہے۔ تحفۂ اخلاص کے عوض راندۂ درگاہ ہوتا ہے۔ تو مجبوراً اسے جسمانیات سے بلند ہوکر روحانیت کی فضائے علوی کی طرف صعود کرنا پڑتا ہے۔ روحانیت کے جنوں میں طلبِ منفعت تو ہوتی ہی نہیں جو اندیشہ زیاں ہو۔ یہاں تو شروع سے آخر تک تعلیم فنا ہے۔ پس اس کارزارِ نفس میں تو ہار کا نام جیت ہے۔ اس لئے دل کبھی شکست کے امید سوز ہنگامے سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ ریاضت کے لئے جاؤ خود بلند ہوتے جاؤگے بارگاہِ رب العزت میں نہ سوالِ طلب ہوگا نہ جواب نفی و اثبات کا اندیشہ۔ یہ ایسی یک طرفہ ریاضت ہے۔ کہ اس میں مطلوب کی عنایت و بے اعتنائی سے اصل مدعا پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ سفلی تعلقات میں تو بیم و رجا کی حالت ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ وجودِ غیر پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس لئے ناکامی و مایوسی بلائے جان ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانی ریاضت میں جب انسان اپنے تئیں رب سرمد میں فنا کردے۔ تو خوف ناکامی نہیں رہتا۔ اس لئے انسان جسقدر ریاضت کرتا جائے۔ اُسے بقدرِ مشقت اطمینان قلب میسر آتا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے قلبی تعلقات کو ایک لمحہ بستہ ایک نگاہِ نفرت جو عموماً بجوابِ جانفروشی ہوا کرتی

ہے تہس نہس کر دینے کو کافی ہے پس اگر اطمینان قلب چاہو۔ تو پیکرِ محسوس کو چھوڑ کر بن دیکھے خدا کی طرف رجوع کرو۔

طبیعت کو یکسُو کرنے کے لئے ارادہ ہے کہ کسی ایک خدا رسیدہ کے دامنِ فیض سے اپنے تئیں وابستہ کر لوں۔ یہ محض نظام عمل قائم کرنے کیلئے کرونگا۔ ورنہ میرے مذہبی خیالات سے تو آپ آگاہ ہی ہیں۔ میں انتہائے تقوے ذاتِ واحد میں جذب ہو جانے کو سمجھتا ہوں۔ خواہ کسی طریق سے ہو اس لئے میں خدا رسیدہ مرد کے لئے پابندئ صوم وصلوۃ کو ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ پابندیاں تو جُہلا کے لئے ہیں۔ کیونکہ عوام کے لئے جب تک ایک دستور العمل نہ ہو نظامِ عالم قائم نہیں رہ سکتا۔ جس طرح سیاسی قوانین بھی نادانوں کو حلقۂ اطاعت میں رکھنے کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ ورنہ واضعین کسی قانون کے محتاجِ ہدایت نہیں ہوتے۔ ایسے ہی نماز روزے کی پابندیاں بے ذوق آدمیوں کے لئے ہیں۔ نماز تو ذریعہ ہے۔ ایک خاص مقام پر پہنچنے کا۔ جب اس مقام محمود تک رسائی ہو جائے پھر نماز مشین کی حرکات سے زیادہ نہیں رہتی۔ آپ یہ اعتراض کریں گے۔ کہ نماز روزے کی پابندی اگر علماء کے لئے فرض نہ ہوتی۔ تو بڑے بڑے مجتہدین مجددین امام وصحابۂ کرام اور خود حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کیوں کاربند ہوتے۔ اسکا جواب میری سمجھ میں یہی ہے کہ "واعظ جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں" اسلئے جس امر کی عوام کو تلقین کی جائے خود بھی کر کے دکھانا چاہئے۔ ورنہ عارف باللہ کی عبادت کو پانچ وقت پر معین کرنا کیا ضرور ہے عارف کا تو ہر وقت وہر لحظہ ذاتِ باری کے ساتھ متصل تعلق ہی اس کی بہترین عبادت ہے۔ وہ تو پانچ وقت نماز پڑھ کر عوام کو سمجھاتا ہے کہ دیکھو

اس طرح جادۂ عبودیت پر پڑ کر تم بھی تزکیہ نفس کے مراحل طے کر کے عارفِ حق بن سکتے ہو۔

پس میں تو سب کاروبار چھوڑ کر تلاشِ حق میں نکلنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے علم عربی کی ازبس ضرورت ہے لہٰذا فی الحال اورنٹیل کالج سے مولوی فاضل کی تکمیل کا ارادہ ہے عنقریب آپ کو لاہور آکر ملوں گا"

خیر اندیش ......

مینے بلاغت اللہ کو یہ خط دکھایا تو اس نے حسب عادت مرحوم کی مخالفت میں میرے کان بھرنے شروع کئے کہ دراصل مرحوم کا وہی ہم درس لاہور کے کسی کالج میں پڑھنے کے لئے آرہا ہے۔ پس وہ بھی مولوی فاضل کا ڈھکوسلا کھڑا کر کے اس کے ہم رکاب ہونا چاہتا ہے۔ اگرچہ بلاغت نے تو یہ بات عیب چینی کے رنگ میں کی تھی۔ مگر میں تو اس استغراقِ الفت کی بھی داد دیتا ہوں۔ اگر شغف کامل کے ماتحت کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس کے ڈھنڈورہ پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس اگر مرحوم نے اپنے اصل مدعا کا لوگوں سے اخفا کیا تو بجا کیا تشہیر الفت کونسی شرافت ہے۔ اگر ذوقِ عشق کا حاصل علم ہو تو زہے نصیب ہم خرما و ہم ثواب۔

آہ یہ اس کی زندگی کا آخری دور تھا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں امتحان سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ تو نرگس کو تپ کہنہ میں مبتلا پایا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی۔ کہ مریضہ کو تبدیل آب و ہوا کے لئے پہاڑ پر لے جانا چاہئے۔ مریضہ کا تنہا جانا دشوار تھا۔ اس لئے مرحوم کی دو پھوپیاں ایک والدہ ایک ہمشیرہ اور چھوٹا بھائی کل سات آدمیوں کا قافلہ سفر کشمیر کے لئے تیار ہؤا۔ سرینگر کے مضافات میں پہنچکر مرحوم کو یکبارگی تبدیل موسم سے تپ محرقہ

کی شکایت ہوگئی۔ ہفتہ بھر کی بیماری سے مستورات گھبرائیں۔ موٹر کار کی
سواری کا انتظام کر کے اُلٹے قدم بھاگا دوڑ مریض کو لے کر راولپنڈی پہنچیر
آہ۔ راولپنڈی پہنچتے ہی جان ہار نے عین عالم شباب میں عزیز و اقربا کو
داغ مفارقت دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لاشہ با ہزار خرابی گھر پہنچا۔ تو
شہر میں ایک کہرام مچ گیا۔ دور دور کے دوست احباب جنہیں بروقت اطلاع
مل سکی۔ آخری زیارت کے لئے آئے۔ اور روتے ہوئے واپس ہوئے۔
مرحوم کے بے شمار احباب اور قارئین کرام سے درخواست ہے کہ مرحوم
کے لئے دعائے مغفرت فرما دیں۔ مرحوم اس دنیا سے تو محروم وفا گیا۔
خدا نہ کرے کہ حوران بہشتی سے بھی بے وفائی دیکھے ؛
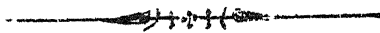
عالمِ رؤیا

اُردو علم ادب کے شیدائی ایشیائی اندازِ تحسین سے خوب واقف ہیں۔
وہ لوگ جو اپنی زندگی میں نا اہل ہمعصروں کے وحشیانہ سلوک سے تنگ آکر
گوشۂ عافیت ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ واصلِ حق ہوتے ہی کسقدر ہر دلعزیز
ہوگئے اور وہ غریب جو قیدِ ہستی کی سختیاں جھیلنے کو زندہ ہیں اگر اس فقدانِ
مذاق کے دور میں کوئی اچھی چیز پیدا بھی کریں۔ تو چاروں طرف سے ایسی
لے دے ہوتی ہے کہ بیچارے تو غیر مصنف کو اپنا نام بمصلحت نیست کہ
از پردہ بروں اُفتد رازؔ کے شوق خیز مصرع میں چھپانا پڑتا ہے۔ ہمارے
غیر ذمہ وار نقادانِ سخن جو خصوصاً موسم برسات میں خِلقت آبی کی طرح ادبی
رسالوں میں ہم آہنگ ہو کر منہ چڑانا شروع کرتے ہیں۔ مرے ہوؤں کی
مدح میں جسقدر رطب اللسان ہوں سعی عبث کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہشتی
روحیں تو مدت ہوئی تحسین ناشناس سے بے نیاز ہو چکی ہیں لیکن کسقدر
حیرت ہے۔ ان کی بے باکانہ شوخیٔ تحریر پر کہ زندہ مصنفوں کے جوابی
حملوں سے بالکل نڈر ہو کر زمانہ حال کی بہترین تصنیف پر حرف گیر ہوتے
نہیں شرماتے۔ افسوس دنیا سے مروت کیسی اُٹھ گئی ہے۔ اگر بے رحم نقاد
اس قحط الرجال میں چند ایک مغتنم وجودوں کی قدر افزائی سیاسی مصلحت
ہی سے فرما دیا کریں۔ تو امنگوں والے دلوں کے حوصلے پست نہ ہوں۔
اب بھی ۔۔۔ چند اردو کے نام لیوا باقی ہیں۔ ماناکہ اربابِ دہلی و لکھنؤ

کے مٹے ہوئے ناموں کی برابری نہ کرسکیں۔لیکن آخر ماضی کی روائتیں نہیں کے نام سے زندہ رہ سکتیں ہیں۔پس وہ لوگ جو تعصب مقامی کی وجہ سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ذرا دور اندیشی سے کام لیں۔تو اب بھی میر و مرزا۔ذوق و غالب کی شہرت کو چار چاند لگانے والے پیدا ہو سکتے ہیں۔لسانًا نہ سہی خیالًا ہی سہی۔شوکت الفاظ کھو کر اگر بلندئ خیال میسر ہو تو کیا بُرا سودا ہے +

ہمارے معزز نقاد موجودہ نسل کی علمیت کو ایسا ہی سطحی سمجھتے ہیں تب بھی داد دینے میں اتنا بخل کیوں۔بلکہ انکی بیش قیمت داد جسقدر مبالغہ کے ساتھ اصل کو بڑھا کر دکھائیگی۔اسی قدر پر حجاب مصنف سے صدقۂ شکریہ کی زیادہ مستحق ٹھہریگی۔اگر ہندوستان کی شہرۂ آفاق رقاصہ گوہر کو آپ سہمی ہوئی شکل بنا کر چہرے کی ہیئت تبسم کریاں سے بگاڑ کر گویا کہ جسارت کلام پر خواستگار معافی ہوتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں خراج تحسین پیش کریں تو وہ یقینًا ولایتی شوکی لانبی ایڑی پر اکڑ کر ایک ثانیہ کھڑی رہ کر گول چکر بھرتی ہوئی اپنی برقِ نگاہ سے آپ کے دامنِ صبر و قرار کو خاک سیاہ کرتی ہوئی خندہ استہزاء کے ساتھ چھلاوے کی طرح نظروں سے غائب ہو جائے گی۔کیونکہ وہ تو شب و روز ایسی ہی ستایش سُنتے سُنتے تنگ آ گئی ہے۔لیکن ایک معمولی مغنیہ جو اپنا پیٹ پالنے کے واسطے ہر ایک سوقی مزاج مفلس رئیس کی بزم گرمانے میں اپنے کسبی فن کو ارزاں بیچتی رہی ہے آپکی داد کو اپنی شہرت کا یقینی ذریعہ سمجھ کر ہمیشہ گوش بر تحسین رہیگی۔معقول ستائش جسکا ہم اپنے تئیں جائز حقدار سمجھتے ہیں ہم محض ڈوبے ہوئے قرض کی طرح وصول کرتے ہیں۔لیکن وہ گرانقدر تعریف جس کے ہم اہل نہ

ہوں۔ اگرچہ حوصلہ افزا ہی ہو۔ نفسِ خوددار کو رہینِ منت کر جاتی ہے۔ لیکن ادبی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نکتہ چین جماعت جب تک لبِ گورِ مصنف کی ناقابلِ مرگ شہرت سے مجبورِ ستائش نہ ہو جائے ہرگز خوبی کی معترف نہیں ہوتی۔ اور جسوقت یہ خوردہ گیر فرقہ آمادۂ مروت ہو۔ تو صعوبت آشنا مصنف شرمندہ احسان ہونا گوارہ نہیں کرتا۔

نوخیز مصنف کی بالیدگیٔ خیال کے لئے توعیب بین حضرات کا نفسِ آتشین گلا گھوٹنے والی سموم کی طرح مرگ آور ہوتا ہے۔ یہ حضرات قلم کی خفیف سی جنبش سے لطیف پیکرِ مصنف کو قعرِ گمنامی میں گرانے کی خاص مہارت رکھتے ہیں۔ نکتہ چینوں کی بے مہری کی تو یہ کیفیت ہے۔ اس پر بھی اہلِ قلم حضرات کی جمہوریت ایک آساں گسل رشتۂ ربط سے بندھی ہوئی ہے۔ اگرچہ آج کل اہلِ قلم میں پہلی سی الفت و موانست باقی نہیں جو متاخرین میں باوجود حریف ہونے کے ادبی محاربات کے دوران میں بھی زندہ رہ سکتی تھی۔ اور اگرچہ آجکل رشحاتِ قلم کا مقصدِ حاصل زیادہ تر شہرت آفرینی ہی ہوتا ہے لیکن اب بھی بے غرض خادمانِ ادب کی کمی نہیں جو خاموشی کے ساتھ ذخیرہ علمی میں متعدبہ اضافہ کئے جا رہے ہیں۔ جسے بقدرِ جنس قدر ناشناس زمانے کی دست برد سے آزاد رہ کر ضرور بقائے دوام نصیب ہوگی۔

میں ان ہی خیال میں مستغرقِ عالمِ خیال میں جا پہنچا۔ اور جو کچھ فسانہ بافِ دماغ کی طفیل مجھے نظر آیا ہدیہ ناظرین ہے اسے بوجہ حقیقت کی جھلک رکھتے ہوئے تمثال بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور صحتِ واقعات اور صفائیٔ مشاہدہ کی وجہ سے خوابِ پریشاں بھی نہیں کہہ سکتے۔ رویائے

نظری کہوں تو شائد درست ہو۔

میں ایک مشہور ریلوے اسٹیشن کے احاطۂ بیرونی کے درِ خارجہ میں ٹہل رہا تھا۔ جہاں اونٹ گاڑی چھکڑوں ٹم ٹم تانگہ شکرم وکٹوریا لینڈو فٹن اور موٹر کاروں کے اژدہام میں ایسا پھنسا تھا کہ مجھ جیسا ہلکا پھلکا انسان یلدرم کی لطافتِ خیال کا بوجھ سنبھالے ہوئے اپنے لئے کہیں کھڑے ہونے کی جگہ نہ پاتا تھا۔ مسافر ریل سے اتر کر بسرعت دھکا پیل میں سے گذرتے ہوئے گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ میں بھی اس خیال سے کہ کہیں تامل سے رہ ہی نہ جاؤں بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مختلف گاڑیوں پر منزلِ مقصود کے نام جلی حروف میں چوبی تختہ پر لکھے ہوئے آویزاں تھے۔ غالباً یہ منازل کی جغرافی کیفیت ظاہر کرتے تھے ایک شکرم پر لکھا تھا "منزل عشرت" ایک اونٹ گاڑی "مشقت آباد" کا پتہ دے رہی تھی۔ ایک اور فٹن "دیارِ حسن" جانے کو تیار تھی۔ ایک لینڈو "دولت گڈھ" کے لئے مسافر لے رہی تھی۔ میرا ہوسناک دل ان میں سے ہر ایک کی سیر کے لئے مچل رہا تھا۔ چنانچہ میں "عشرت منزل" میں پہنچنے کے لئے لمبے لمبے قدم بھرتا شکرم کی طرف جا رہا تھا اور میرا دل اس جنت ارضی کا نقشہ چشمِ تخیل کے آگے پیش کر کے مجھے ہمیشہ کی طرح فکرِ عاقبت سے آزاد کئے ہوئے تھا۔ کہ اونٹ گاڑی سے ایک درد آشنا آواز نے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اگرچہ مخاطب میں نہ تھا۔ مگر آواز کی رقت ایک رفیق کی طالب معلوم ہوتی تھی۔ شنیب کی آواز میں اگرچہ موسیقیت نہیں تھی۔ لیکن اسکا سازِ زندگی درد و سوز و رقت سے پر تھا۔ اور ان سب کا مجموعہ شاعری اسکی فطرتِ مضمرہ میں روح کی طرح سمائی ہوئی تھی۔

اور وہ خود نہیں جانتا تھا کہ میں شاعر ہوں لیکن اس کے دوستوں کے لئے اسکی تمام زندگی ایک مکمل شعر تھی جسکا حل احباب کی مشترکہ سازش دماغی سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بہت کسر نفسی کے ساتھ اپنے تئیں فقط ایک موزوں مصرع سمجھا کرتا تھا۔ اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا یا جب سے اسے اپنی جہت شعری کا علم ہوا تھا۔ وہ مصرع ثانی کی "تلاش" میں تھا۔ آہ اس کی زندگی بھی سعی تکمیل حیات میں رائیگاں جاتی نظر آتی تھی۔ ہاں وہ شاعر تھا۔ لیکن فنِ موسیقی سے ناآشنا۔ کہا کرتا تھا کہ شعر بلا موسیقی مصنوعی پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ وہ اپنے شعر حیات میں دلنواز راگ۔ روح پرور گیت۔ موسیقی مجسم یعنی عورت کا متلاشی تھا۔ عربی النسل شعیب اس وقت اپنے حُدی خواں آبا کی طرح بے ڈول گاڑی کے بلند کوچ بکس سے بے ساز مگر پرسوز آواز میں غالب کا یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم قضا بگردشِ رطل گراں بگردانیم

میں شعیب کے ملنے کے اشتیاق میں "عشرت منزل" کی شکستہ چق پر نگاہ یاس ڈالتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس لوٹا۔ اونٹوں کی جوڑی اپنے صحرا نورد رفتار پر چل پڑی تھی۔ محنت آشنا شعیب نے وہی شعر مجنونانہ انداز میں چیخ چیخ کر پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ترکی ٹوپی سر سے اتار کر میری جانب ہلانی شروع کی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج وہ کوئی نیا پیغام جو اس کے قلب پر اُترا ہوا ہے۔ مجھے پہنچانے کے لئے بے تاب ہے۔ پس میں نے بھی گھیردار شلوار کو سمیٹ بیگ مونڈھے پر رکھ بے تحاشا بھاگنا شروع کیا لیکن یلدرم

کے پیکرِ خیال کا بوجھ مجھ پر ایسا حاوی ہو چکا تھا۔ کہ مجھے میرے پاؤں
من من بھر کے معلوم ہونے لگے۔ اونٹ گاڑی اب آبادی سے نکل
صحرائے یاس کو عبور کر رہی تھی۔ میں اس ہولناک صحرا میں پہلے بھی کئی
مرتبہ خاک چھان چکا تھا۔ لیکن اس کی بے پایاں وسعت میری جسمانی
طاقت کی حدِ شمار سے زیادہ تھی۔ میں اچک اچک کر خیال کے پردہ
پر اُڑ کر باہر جانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر بسا اوقات صحرائے یاس
میں ریگ رواں کی لہروں اور آنکھوں میں خاک جھونکنے والے بلاخیز
طوفان کا مقابلہ کرنا میرے لئے ناممکن ہوا کرتا تھا۔ میں تو اس قیس فر
خطہ سے زندہ گذرنا اپنے لئے محال قطعی سمجھتا تھا۔ مگر اس دفعہ شعیب
کی ہمت افزا آواز مجھے برابر دوڑائے جا رہی تھی۔ مجھے اپنے چھ فٹ دو
قد کے ساتھ گمانِ حسن تو نہیں البتہ قریب وجاہت ضرور ہوا کرتا تھا۔
اور مجھے اپنی لانبی ٹانگوں کی تیز روی پر فخر بھی تھا۔ لیکن آہ میں
باوجود اپنے دوست کی مسلسل صدائے درد پر اونٹ گاڑی کو نہ لے سکنے
میں بھی مجبور تھا۔ ہر قدم پر میرے پاؤں بارِ تخیل سے صحرائے یاس کی
ریگ میں دھنسے جاتے تھے۔ اس کشمکش نے مجھے ادھ موا کر دیا
تھا۔ شدتِ تشنگی سے مجھے غشی سی ہونے لگی۔ آخر تھک کر گر پڑا۔
معلوم نہیں شعیب کو منشی آباد میں کتنی مشکلات کا سامنا ہو۔ خیر شکر
ہے بیچارا اس مردم کش صحرائے یاس سے تو نکل گیا۔

میں صحرائے یاس سے گذرنے کی ورزشِ جنون سے تھک کر واپس
تو مجھے راستے میں "دیارِ حسن" جانے والی فٹن فون البھڑک ملبوس سواریوں
سے لدی ہوئی ملی۔ میرا پرانا رفیق مظہر جسے میں ۲۴ سال سے جانتا ہوں

اور شاید میرے سوائے دُنیا میں اور کوئی بھی اُسکے اندرون قلب کی جذباتی کیفیت سے اچھی طرح واقف نہیں) کوچ بکس پر ڈٹا ہوُا نظر آیا۔ وہ اگرچہ "دیارِ حسن" کو جا رہا تھا۔ لیکن آنے والی خوش منظر بستی کی دلفریبیوں سے مستغنی "قانونِ بین الاقوام" کی ایک ضخیم جلد کے مطالعہ میں منہمک تھا اِس کی زندگی کے تین پہلو تھے دُنیاوی مذہبی اور جذباتی لیکن یہ کمال اسی میں تھا کہ جس وقت وہ ایک کام میں لگا ہو تو بالکل اسی میں منہمک ہو جایا کرتا تھا۔ اسکی فطرت متضاد رنگوں سے مرکب تھی۔ جس وقت وہ علمائے امت کے حسن سوز نرغے میں پھنسا ہوُا آیہ استخلاف کے ہمہ گیر معنوں کی توضیح میں تقریر کر رہا ہو۔ تو واقعی اسم با مسمے مظہر الاسلام معلوم ہوتا تھا۔ لیکن چیف جسٹس ہائی کورٹ کو دورانِ اجلاس کی معمولی اور ضروری نیند سے بضرب استدلال بیدار کر کے خراج تحسین حاصل کرنے کا ڈھب بھی خاص مسٹر مظہر ہی کو معلوم تھا۔ اسقدر متدین اور عالم متبحر ہونے کے باوجود اسنے فریب وفا کے جادو سے ایک عالم کو مسخر کیا ہوُا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر بے شمار خوش نما تیتریاں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس وقت چونکہ وہ مطالعہ میں مصروف تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے بالکل زاہد فنافی الوجود (مگر تنگ دل و کور بصر) کی مانند قدرت کے حسنِ منقوش و باریک سے بے خبر بے پروا قانونی کتاب کے صفحے کے صفحے دماغ میں جذب کئے جا رہا تھا۔ کسی وقت زرد و سرخ رنگ کی تیتری نہایت شوخی سے اسکی کتاب پر آ بیٹھتی اور اب وہ صدقۂ التفات کے لئے مجبور ہو جاتا۔ اور اس سے بچوں کی طرح کھیلنا شروع کر دیتا۔ لیکن آہ اسکی یہ حسن شناسی بچپن ہی سے بہت پُرلون

رہی ہے۔ چنانچہ اب بھی زود سیر مظہر جذبات انگیز تیتری کو ایک نفس بارہ
سے اُڑا کر پھر کتاب میں ڈوب جاتا۔ لیکن فریب خوردہ تیتری اس کے
گذشتہ التفات سے واقف ہو کر پھر اس کے رخسار پر آ بیٹھتی۔ تو
وہ بجائے تبسم رقت کے جو عموماً اس کی عشق آشنا فطرت کا تقاضا ہوا
کرتا تھا۔ بہت بے دردی سے تیتری کے رنگین پروں کو چٹکی میں مسل
ڈالتا۔ اب وہ اس کے غبار بے جان کو ناک کے پاس لا کر سونگھتا۔
اور اپنے گذشتہ خون آشام کھیل کی یاد میں جو اس نے مرحوم تیتری کے
حسنِ پراں سے کھیلا تھا۔ اور ایسے کھیل وہ میری چودہ سالہ آشنائی
میں ہزاروں مرتبہ کھیل کر پشیمان ہو چکا تھا۔ اس کی چشمِ اشکبار سے
آنسوؤں کی لہر رواں ہو جاتی تھی۔ یہی خراجِ گریہ تھا۔ جو اس تیتری کو
اور اسی قسم کی بے شمار تیتریوں کو جو اس کے آغازِ التفات سے دھوکہ
کھا جاتی تھیں پیش کر سکتا تھا۔

مظہر کی آنکھ مجھ پر پڑی۔ تو اُس نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے
مجھے دعوت سیر دی۔ لیکن میں جانتا تھا۔ کہ اس وقت وہ محض ایک
ایسے شخص کا متلاشی ہے جس سے وہ اپنے گذشتہ ایک سال
کے تجربات زندگی کو اور جو زیادہ تر کسی پیکرِ حسن و حساس کو سراب وفا
کی طرف بلانے اور رشتہ محبت رکھ کر بار نے سے تعلق رکھتے ہونگے)
سنا کر اپنی سوانح حیات کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے تو صحرا ئے یاس
کی تک و دو نے "دیارِ حسن" کی تفرج گاہوں سے بھی بیزار کر دیا تھا۔ اب
گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ناکامِ زلیست انسان کی طرح نوحۂ زندگی لکھنا
چاہتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا۔ کہ عشق افروز حکایہ سنانے کے لئے مظہر کا

پیٹ پھٹ رہا ہوگا۔ پس میں نے اپنے دل سے یہی فیصلہ کیا کہ مظہر کو
اسکی نزہت گاہ میں اکیلا سیر کے لئے چھوڑ کر خود آلامِ حیات کو قطع کرنے
کی فکر کروں۔ ہاں یہ میرے دماغ کا مشورہ تھا۔ ورنہ کمبخت دل نے تو
جہاں حسین شے کا نام سنا اور میرے تنگ سینے میں خوشی کے مارے ناچنا
شروع کر دیا۔ آہ میں اپنے دل کے روح فرسا ناچ سے تنگ آگیا تھا۔
میرے معالج اس کے رقصِ ترنم کو دل کے دھڑکنے سے تعبیر کرتے تھے
خیر یہ تو ان کی غیر ذوقی طبیعت کا تقاضا تھا کہ جس چیز کو میں اور میرے
ہم مشرب رقص کہیں یہ کمبخت گروہ اسے دھڑکن بتاتا تھا۔ اُف کیسا
بھونڈا لفظ ہے۔ جیسے کہ کوئی بڑا سا ڈھیلا گہرے تاریک کنوئیں میں
پھینک مارے۔ میرے دل کی مخالفت میں جو مشورت بھی میرے دماغ
نے مجھے دی وہ ہمیشہ خیر کا موجب ہوتی رہی ہے۔ اس لئے میں نے
یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ ہمیشہ دماغ کے پیشکار عقل کی صلاح پر
کاربند ہوا کروں گا۔

پس میں "دیارِ حسن" کا خیال چھوڑ کر "دولت گڑھ" جانے والی لینڈو
کے پیچھے ہو لیا۔ لینڈو میں میرا دوست آذری ٹھسے سے بیٹھا ہوا نظر
آیا۔ اس کے چہرے کی سُرخی سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ گویا کوئی نفع آور
ٹھیکہ دولت گڈھ میں مل گیا ہے۔ ورنہ وطن پرست زن مرید آذری
گھر چھوڑنے والا کب تھا۔ اسے تو اپنی سودیشی بیوی سے جو اگرچہ
بطریق لاٹری والدین کی جابرانہ شفقت سے حاصل ہوئی تھی عشق کا
تعلق تھا۔ سادہ مزاج نیک دل آذری میں عیب چینی کا مادہ قطعی نہیں
تھا۔ چنانچہ مجھے اس کی گفتگو اسی لئے پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ اُسنے

آج تک کبھی میری بات کی مخالفت نہ کی تھی۔ اس لئے اسکا مشورہ بھی چنداں مفید نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر تجویز پر جو میں اس کے سامنے بغرض صلاح پیش کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ بلاچون وچرا میری ہاں میں ہاں ملا دیا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ آرزو کرتا تھا۔ کہ وہ میری مخالفت کرے۔ میرے تحکمانہ انداز کو چشم حقارت سے دیکھے۔ میری بے اعتدالیوں پر مجھے ملامت کرے۔ مجھ سے اپنا حکم منوائے۔ ہمارے پُرسکوں تعلق دوستی میں نمائشی لڑائی ہی سے کچھ تلاطم پیدا ہو۔ لیکن آہ اس کی بے صدا زندگی قبرستان کے سکوت کو شرماتی تھی۔ اُسنے کبھی کسی دوست کی شکایت نہیں کی۔ کبھی زمانے کے ہاتھوں فریادی نہیں ہؤا۔ یہاں تک کہ عام ہندوستانی شوہر کی طرح اجو گھر کی چاردیواری میں خودمختار وحشی بادشاہ کی طرح حکمران ہوتا ہے اُسنے کبھی اپنی بیوی سے بھی ناملائم سلوک روا نہیں رکھا۔

آذری نے لینڈو سے باہر نکال کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ کیونکہ کم سخن آذری بہت سی باتیں اشاروں ہی سے کرجایا کرتا تھا۔ اور اگر کبھی کوئی مطلب بتانے کے لئے لب کشا ہوتا بھی تو اس کی لمبی بات اور ٹوٹے ٹوٹے فقرے میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ لیکن ہماری آشنائی تو اب اس درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ کہ جہاں زبان کی بجائے آدمی نگاہوں سے مطلب براری کرسکتا ہے۔ لینڈو بہت تیز جارہی تھی۔ میں اُچک کر چڑھنے لگا۔ پائیدان سے پیر پھسلا اور دھڑام سے نیچے آرہا۔ اتنے میں آذری یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہوگیا۔

میں گرتا پڑتا واپس ریلوے سٹیشن کے احاطے میں پہنچا۔ تو دیکھا

کہ ایک خاک آلود موٹر کار جو ابھی لمبا سفر طے کر کے آئی تھی سواریاں لینے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ موٹر کے ماتھے پر ایک خوشرنگ تختہ آویزاں تھا۔ جس پر لکھا تھا "دارالشہرت"۔ اس بنیا دل کو ایسے مقام سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی۔ لیکن میں تو افکار و آلام سے بھاگتا پھرتا تھا۔ اب فقط یہی راہ کھلی تھی ہوس ناک دل میں گدگدی ہوئی۔ کہ دیکھوں دارالشہرت میں میرے قماش کے لوگ بھی زندگی بسر کر سکتے ہیں یا نہیں ؛

میں نے فوراً سن رسیدہ شوفر کو اپنے ارادہ سفر سے مطلع کیا۔ شوفر خلیق آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آنکھوں کی چمک اور رخساروں کے شکن اور ابراؤں کی مسلسل جنبش سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ بہت باتونی آدمی ہے چنانچہ میرے سوال پر اُس نے باتوں کی جھڑی باندھ دی ؛

کہنے لگا "مجھے عجیب عجیب مسافروں کو لے جانیکا اتفاق ہوا ہے۔ گاڑی بانی کا پیشہ تو میرا موروثی ہے۔ میرے دادا نے میر تقی اور سودا جیسے مشاہیر کے ساتھ بہلیوں کا صبر شکن سفر کیا ہے۔ مصحفی۔ جرأت اور انشاء کو لمبے لمبے سفر کرائے ہیں۔ لیکن جس قدر تکلیف سودا اور انشاء نے دوران سفر میں ہمراہی مسافروں کی ہجو گوئی سے دی ہے۔ اگر مجھے پیش آتی۔ تو میں تو یہ پیشہ ہی ترک کر دیتا۔ میں ابھی داغ امیر مینائی آزاد شبلی وحالی کو دارالشہرت پہنچا کر آرہا ہوں۔ بیچارے بہت مرنج مرنجاں مسافر تھے"۔

میں نے کہا "میں خود ... سے بیزار ہوں۔ کسی کو کیا آزار پہنچاؤں گا۔ اگر مجھے اس سفر میں ہمراہ لے چلیں۔ تو آپ کے مسافروں کی باتوں سے دلبستگی پیدا کر کے رنج دنیا کو زائل کردوں گا۔ ذرا دروازہ کھولئے۔ میں بھی

کسی کونہ میں دبک کر بیٹھ جاؤں"۔

شوفر نے دروازہ تو بند ہی رکھا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے اچھی طرح گھور کر کہنے لگا۔"کیوں صاحب آپکے ساتھ اسباب کچھ نظر نہیں آتا۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن زادِ راہ تو ہر مسافر کے لئے ضروری ہے۔ اور میں تو آپ جانتے ہیں۔ کرایہ کے علاوہ بھی دستور کے مطابق مسافروں سے اُن کے اسباب کی حیثیت کے بموجب انعام لیا کرتا ہوں، اور جو مسافر قیمتی اسباب ہمراہ نہ رکھتے ہیں اُسے موٹر میں جگہ دینا خلاف اصول سمجھتا ہوں"۔

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ تو ناں مجھے اپنے بیگ کا خیال آیا۔ اس میں سے چند نسخے حضرت یلدرم کی تصنیف لطیف کے نکال کر شوفر کو درخشاں سرورق اور کتاب کی عمدہ لکھائی چھپائی سے مرعوب کرنا چاہا۔ اُسے سمجھایا کہ "یلدرم نے حال ہی میں ادبی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ چونکہ جس اسلوب پر وہ اکثر لکھا کرتے ہیں۔ وہی مجھے بھی مرغوب ہے۔ اسلئے اُن خیال آرائیوں کو ترجمان بنائے پھرتا ہوں۔ جو خیالات میرے دل میں پیدا ہوکر بے زبانی کی وجہ سے زیب قرطاس نہیں ہوسکتے وہ ان کی جادو بیانی سے آج تمام ملک میں پھیل چکے ہیں۔ میں ان کی تصانیف فروخت کرنے کے لئے سفری ایجنٹ تو نہیں۔ البتہ ان کی کتاب کی جدت شعری پر لکچر دینے کے لئے چند نسخے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں تاکہ وہ ٹھوس طبیعت رکھنے والے لوگ جو جذبات لطیف پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مجذوب کی بڑ کی طرح بے ربط مہمل فقرے ثقیل الفاظ کی بندش میں جکڑ کر لکھ دیا کرتے ہیں۔ دیکھیں کہ خود محسوس کرنے والا آدمی کس طرح

اُن احساسات کو جواب تک بوجہ عام زبان کی ثقالت اور ٹھوس پن کے الفاظ میں ترتیب نہیں پا سکے قلم بند کر سکتا ہے۔ وہ تمام جذبات انسانی جن کا سرچشمہ ذکی الحس دل ہے۔ ان کی صنعت تحریر سے حقیقت کا اثر لئے ہوئے دُنیا کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یلدرم اگرچہ "لساناً" شہرہ آفاق شاعر نہیں مگر "حساً و فکراً" تو حقیقی شاعر ہے اُس نے شاعر اور عاشق کے غیر ممکن البیان جذبات کی تصویر لفظوں میں کھینچ کر رکھ دی ہے"۔ چنانچہ شوفر نے حکایۂ لیلےٰ و مجنوں سے چند صفحے پڑھے اور اُسکی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی۔ قیس کی آخری دعا پڑھ کر بڈھا شوفر آبدیدہ ہو گیا۔ اور کتاب مجھے واپس کر دی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ کاش فرسودہ دماغ شوفر "سودائے سنگین" میں فلسفہ حُب کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا۔ لیکن آہ! شوفر یکطرف ہندوستان کے بہتیرے گل و بلبل کے شیدائی۔ تیغ ابرو کے گھائل۔ سلاسل زلف کے قیدی یعنی ہمارے متبرک قافیہ پیما بزرگ "سودائے سنگین" اور "خارستان و گلستان" میں فرامرز کو مجنوں اور خارا اور نسرین نوش کو عرف عام میں عاشق و معشوق سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے۔!

مجھے تہیدست سمجھ کر بڈھے شوفر نے بے تکلفی کے لہجے میں کہا۔ "صاحب اگر آپنے جگہ روک لی۔ تو میں اور مسافروں کو کہاں بٹھاؤں گا۔ آپ ذرا باہر ٹھیریں۔ اگر گنجائش ہوئی۔ تو آپ کو بھی ساتھ لے چلوں گا"۔ میں سڑک کے کنارے برحالت یاس میں کھڑا ہو گیا اور مسافروں کی آمد و شد کا تماشہ دیکھنے لگا ۔

ایک آدمی میانہ قد گندمی رنگ چھدری داڑھی جو ٹھوری پر آ کر گھنی اور

گھنگریالی ہوگئی تھی۔ موٹے موٹے آبنوسی ہونٹ فراخ پیشانی شعلہ فشاں گول گول آنکھیں سر پر کلاہِ فیض اوڑھے ایک بہت لانبا خاکی رنگ کا کرتا پہنے جسکے نیچے سے شرعی پاجامہ ٹخنوں سے آدھ بالشت اونچا مشکل سے ایک فٹ باہر نکلا ہوا نظر آتا تھا۔ پاؤں میں ایڑی بیٹھی سلیم شاہی جوتی پہنے نگاہ زمین کی طرف گاڑے موٹر کی جانب چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنی پشت پر ایک بے ڈول سا بوجھ اٹھایا ہوا تھا۔ جو نوک دار کونوں سے کتابوں کا انبار معلوم ہوتا تھا۔ بوجھ سے اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ میری حیرت کی کچھ انتہا نہ تھی۔ کیونکہ اس ہئیت کذائی میں دیکھ کر گرد و پیش کے لوگ بڑے ادب سے جھک کر آداب عرض کرتے ہوئے اُسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف کو ہٹ جاتے تھے۔ موٹر کے پاس آکر اُسنے اپنی جادو بھری نگاہ سے بڈھے شوفر کو گھورنا شروع کیا۔ جسنے آنکھیں چار ہوتے ہی بڑے احترام سے کورنش بجا لا کر موٹر کا دروازہ کھول دیا اور یہ عجیب الکیفیت آدمی اپنا پشتارہ پا انداز پر رکھ کر ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ مینے ایک قریب کے آدمی سے جو اس نظارے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس معمہ کو حل کرنے کی درخواست کی۔

میرا مخاطب اپنے لباس و شکل و صورت میں بجائے خود ایک تماشا تھا۔ وہ پورا تھان صرف کر کے ایک بڑے گھیر کی بد قطع افغانی شلوار پہنے ہوئے تھا۔ جسکے نیچے سے امریکن ساخت کا بوٹ جسے روزِ خرید سے اب تک وارنش نصیب نہ ہوئی تھی۔ مالک کی بے پروائی کا شاکی نظر آرہا تھا۔ افغانی شلوار پر بے جوڑ علیگڈھی ساخت کی شیروانی زیب بدن تھی۔ جسکا سینے سے نیچے کا بڑا گھیر اسکی تنومندی کا فریادی تھا۔ سر پر

دوپلیہ ٹوپی رکھی تھی۔ موچھوں پر قینچی کا بے طرح استعمال ہؤا تھا۔ چہرے کا قدرتی رنگ داڑھی کی سیاہی سے مستغنی تھا۔ بیٹھی ہوئی ذراسی ناک۔ تنگ پیشانی چھوٹی چھوٹی آنکھوں گول چکنے رخساروں کی ہیئت مجموعی سے یہ شخص نیپال کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے بایاں ہاتھ جیب میں ڈالا ہؤا تھا۔ دایاں ہاتھ پیٹ پر پھیر کر آنکھیں مٹکا کر بولا "یہ حسرت نصیب آدمی ہندوستان میں میر کا آخری وارث سخن ہے۔ ویسا ہی نازک مزاج و نازک احساس بھی ہے۔ پس وارثوں نجتی میں بھی میر کا حقیقی وارث ہے۔ دورِ جدید نے تو بہت شاعر پیدا کر دیئے ہیں۔ لیکن دورِ عتیق کے مرے ہوؤں کی نشانی فقط یہی بدنصیب باقی ہے۔ اردوے معلے نے اس ناقدری کے زمانے میں اسکے ہاتھوں پرورش پائی ہے۔ اسکا کلام رطب و یابس سے پاک سوانح قلبی کا مرقع ہؤا کرتا ہے۔ رواجِ وقت کے خلاف یہ کوئی نظم بھی طبیعت پر زور ڈال کر موجودہ قوافی کے جا و بے جا استعمال کے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ جو کیفیت دل پر وارد ہوتی ہے۔ وہی شعر میں باندھ دیتا ہے جو نغمہ دل و دماغ کی سازش سے پیدا ہو۔ وہی حقیقی شعر ہے۔ ورنہ یوں تو دماغ سوزی سے اردو میں ہزارہا قافیہ نواز شعراء نے دفتر کے دفتر لکھ مارے ہیں۔ اسکے خیال میں اکثر لوگ جنہیں قدرت سے جذبات شناسی کا مادہ ہی عطا نہیں ہؤا شاعری کو علم ریاضی کی طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح ریاضی دان سوالات حل کرتے ہوئے فقط دماغ کا استعمال کرتا ہے اسی طرح اردو نظم لکھنے والے پہلے تو حافظے کی مدد سے قوافی کی ایک طویل فہرست تیار کرتے ہیں اور پھر ان تمام قوافی کو دماغی جد و جہد سے مختلف المطالب و مختلف المعانی

گھنگریالی ہوگئی تھی۔ موٹے موٹے آبنوسی ہونٹ فراخ پیشانی شعلہ فشاں
گول گول آنکھیں سر پر کلاہِ فیض اوڑھے ایک بہت لانبا خاکی رنگ
کا کرتا پہنے جسکے نیچے سے شرعی پاجامہ ٹخنوں سے آدھ بالشت اونچا
مشکل سے ایک فٹ باہر نکلا ہوا نظر آتا تھا۔ پاؤں میں ایڑی بیٹھی سلیم
شاہی جوتی پہنے نگاہ زمین کی طرف گاڑے موٹر کی جانب چلا آ رہا تھا۔
اس نے اپنی پشت پر ایک بے ڈول سا بوجھ اٹھایا ہوا تھا۔ جو نوک ڈاک
کونوں سے کتابوں کا انبار معلوم ہوتا تھا۔ بوجھ سے اس کی کمر جھکی ہوئی
تھی۔ میری حیرت کی کچھ انتہا نہ تھی۔ کیونکہ اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر گردو
پیش کے لوگ بڑے ادب سے جھک کر آداب عرض کرتے ہوئے اُسے
راستہ دینے کے لئے ایک طرف کو ہٹ جاتے تھے۔ موٹر کے پاس آ کر
اُسنے اپنی جادو بھری نگاہ سے بڈھے شوفر کو گھورنا شروع کیا۔ جسنے
آنکھیں چار ہوتے ہی بڑے احترام سے کورنش بجا لا کر موٹر کا دروازہ کھول
دیا اور یہ عجیب الکیفیت آدمی اپنا پشتارہ پاانداز پر رکھ کر ایک طرف کو بیٹھ
گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ مینے ایک قریب کے آدمی سے جو اس نظارے
کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس معمہ کو حل کرنے کی درخواست کی۔
میرا مخاطب اپنے لباس و شکل و صورت میں بجائے خود ایک تماشا
تھا۔ وہ پورا تھان صرف کر کے ایک بڑے گھیر کی بد قطع افغانی شلوار پہنے
ہوئے تھا۔ جسکے نیچے سے امریکن ساخت کا بوٹ جسے روزِ خرید سے
اب تک وارنش نصیب نہ ہوئی تھی۔ مالک کی بے پروائی کا شاکی نظر
آ رہا تھا۔ افغانی شلوار پر بے جوڑ علیگڈھی ساخت کی شیروانی زیب بدن
تھی۔ جسکا سینے سے نیچے کا بڑا گھیرا اسکی تنومندی کا فریادی تھا۔ سر پر

دو پلیہ ٹوپی رکھی تھی۔ موچھوں پر قینچی کا بے طرح استعمال ہؤا تھا۔ چہرے کا قدرتی رنگ داڑھی کی سیاہی سے مستغنی تھا۔ بیٹھی ہوئی ذراسی ناک۔ تنگ پیشانی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں گول چکنے رخساروں کی ہیئت مجموعی سے یہ شخص نیپال کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے بایاں ہاتھ جیب میں ڈالا ہؤا تھا۔ دایاں ہاتھ پیٹ پر پھیر کر آنکھیں مٹکا کر بولا "یہ حسرت نصیب آدمی ہندوستان میں میر کا آخری وارث سخن ہے۔ ویسا ہی نازک مزاج و نازک احساس بھی ہے۔ پس وارثوں نجتی میں بھی میر کا حقیقی وارث ہے۔ دورِ جدید نے تو بہت شاعر پیدا کر دیئے ہیں۔ لیکن دورِ عتیق کے مرے ہوؤں کی نشانی فقط یہی بدنصیب باقی ہے۔ اردوے معلےٰ نے اس ناقدری کے زمانے میں اسکے ہاتھوں پرورش پائی ہے۔ اسکا کلام رطب و یابس سے پاک سوانح قلبی کا مرقع ہؤا کرتا ہے۔ رواجِ وقت کے خلاف یہ کوئی نظم بھی طبیعت پر زور ڈال کر موجودہ قوافی کے جا وبے جا استعمال کے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ جو کیفیت دل پر وارد ہوتی ہے۔ وہی شعر میں باندھ دیتا ہے جو نغمہ دل ودماغ کی سازش سے پیدا ہو۔ وہی حقیقی شعر ہے۔ ورنہ یوں تو دماغ سوزی سے اردو میں ہزاروں قافیہ نواز شعرا نے دفتر کے دفتر لکھ مارے ہیں۔ اسکے خیال میں اکثر لوگ جنہیں قدرت سے جذبات شناسی کا مادہ ہی عطا نہیں ہؤا شاعری کو علم ریاضی کی طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح ریاضی دان سوالات حل کرتے ہوئے فقط دماغ کا استعمال کرتا ہے اسی طرح اردو نظم لکھنے والے پہلے تو حافظے کی مدد سے قوافی کی ایک طویل فہرست تیار کرتے ہیں اور پھر ان تمام قوافی کو دماغی جد وجہد سے مختلف المطالب و مختلف المعانی

اشعار میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ شعر کو مقبول بنانے کے لئے بندش میں ثقالت اور مضمون میں ایسی ندرت پیدا کرنا جو انسانی زندگی کے روزمرہ کے بالکل خلاف ہو۔ کمال شاعری سمجھتے ہیں برخلاف اس کے پرانی شاعری کے اس آخری نام لیوا کے کلام کو پڑھتے جاؤ۔ ہر شعر کو تاثرات وجذبات انسانی کا صحیح نقشہ پاؤ گے۔"

میں نے اپنے مخاطب کی لمبی تقریر ٹھنڈے دل سے سُنی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یا تو یہ شخص اس کا شاگرد ہے جو بوجہ تعلق تلمذ اُستاد کی ہوا باندھنے پر مجبور ہے یا اس کے اقربا میں سے ہے جس کا خون قدرتی طور پر اپنے عزیز کی مدح سرائی کے لئے جوش زن ہے صوری مشابہت کی وجہ سے دوسرے قیاس کو زیادہ صحیح سمجھتا تھا۔ میں نے قطع کلام کرکے پوچھا "آپ کے ممدوح کے ہموطنوں نے ایسے بلند مرتبت شاعر کی طرف سے اسقدر بے توجہی کیوں روا رکھی ہے۔ یہ اس ہیئت کذائی میں جس سے سوائے افلاس ونحوست کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا کیوں پھرتے ہیں۔" میرا مخاطب یہ سن کر آبدیدہ ہوگیا۔ اور کہنے لگا کہ "وہ شاعری کے لئے صداقت اور بے باکی کو ضروری سمجھتا ہے۔ اور جو لوگ یقین رکھتے ہوئے اعلانِ حق سے گریز کریں۔ انکا یہ سخت دشمن ہے منافقت کو اخلاقی موت سمجھتا ہے۔ سکوتِ مصلحت کو گناہ جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسکی آگہی اسکے لئے باعث بدحالی ہوگئی ہے۔ قدرت نے اسے شعر میں کمال پیدا کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ جو احساس ایک شاعر کو قادر الکلام بنا دیا کرتا ہے۔ وہی احساس اُسے صیغہ شعر سے نکال کر سیاست کے دور از کار مباحث میں لے گھسا۔ مگر سیاست اور

منافقت۔ حسن تدبیر اور وقت شناسی۔ ایثار قومی اور مصلحت اندیشی کا بیسویں صدی کی تہذیب میں یکجا ہونا ضروری ہے۔ اس شخص نے اُس زمانے میں ملک کے لئے وہ نصب السعی پیش کیا۔ جسے اُس وقت کے دل و دماغ سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے حریت و استبداد میں حدِ فاصل قائم کی اور ابنائے وطن کو سُنا دیا کہ ؎

قول کو زید و عمرو کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

وہ سب سے پہلا حُر تھا۔ جس نے بتا دیا کہ افراد و اقوام بغیر کسی صحیح نصب العین کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اس نے قوم میں حسِ واقعات پیدا کی۔ اپنی حسرت آفرین زندگی سے بتا دیا کہ شخصی مفاد قومی فلاح پر کس طرح قربان ہو جایا کرتا ہے۔ اسکا تو یہ قول ہے کہ ایثار تزکیہ نفس کے لئے ضروری ہے۔ اور صدقۂ افراد حیاتِ اقوام کے لئے ناگزیر"

یہاں تک کہنے پایا تھا کہ ایک نو عمر شخص نے میرے مخاطب کو شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اور بے تکلفانہ انداز میں بولا "ارے زبیری اپنے پیر طریقت سے جدا یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ چلو موٹر میں جگہ رُک جائیگی"

میرے مخاطب نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور کہنے لگا "حکیم آپکا ہی انتظار تھا" اب مجھے معلوم ہوا کہ میرا مخاطب فقط ایک ہاتھ سے تمام کام کیا کرتا ہے۔ کیونکہ دوسرا بازو پونچے سے کٹا ہمیشہ جیب میں پڑا رہتا ہے ؛

نو وارد شکل و شباہت سے زکی وطباع معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سُرخ و سفید درخشندہ چہرے اور خنداں بشرے سے ظاہر ہوتا۔ کہ یا تو ابھی

تک اُسے آلامِ حیات سے سابقہ ہی نہیں پڑا یا طبعاً وہ ہر قسم کی مصائب و تکالیف کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسکے چہرے پر مستقل تبسم سے علوِ ہمت اور قومی ارادہ کا پتہ چلتا تھا۔ انگریزی لباس میں بے تکلفانہ خرام سے مغربیت کا شیدائی معلوم ہوتا تھا۔ ننگے سر پر سلجھے ہوئے بالوں کی باقاعدہ نشست کے باوجود کہیں کہیں بے ترتیب گھنگھریالے چکروں میں بار بار پتلی پتلی گاؤدم انگلیوں سے شانہ کرتے رہنا اسکے اطمینان قلب کو ظاہر کرتا تھا۔ اسنے مربیانہ انداز میں زبیری کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "زبیری تم زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دیکھو دنیا میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔ جن لوگوں میں خود آگے بڑھنے کی جسارت نہیں وہ دنیاوی جدوجہد میں بہت جلد ہی کٹ جاویں گے۔ اگر چاہتے ہو کہ دُنیا تمہارا لوہا مانے تو تم بھی آہنی استقلال کے ساتھ دل میں قوت عمل پیدا کرو۔ جو لوگ ترقی میں تمہارے حائل ہوں اُنہیں جینے کی مہلت نہ دو ظالم و مفسد پر رحم کھانا ایسا گناہ ہے۔ جسکا کفارہ رحم دل انسان کو اپنی جان سے دینا پڑیگا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپکی ہندوستانی سوسائٹی میں ایک ایسا اخلاقی احساس پیدا ہو جائے۔ جو بے موقع ایثار اور کسل آفریں قربانی کے متعلق قوم کے اجتماعی وجود میں نفرت کی لہر دوڑا دے۔ وہ لوگ جو اسباب جہاں کی فراوانی کے باعث قومی درسگاہوں یتیمخانوں سیاسی مجلسوں۔ با اثر اخباروں اور صحیح الدماغ لوگوں کو بیش بہا امداد کے بھروسے پر رہین منت کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں قومی مریض کے رگ و پے میں سنہری نشتر سے زہر داخل کرتے ہیں۔ ایسی جانسوز امداد سے اثر پذیر خون میں خودداری کے جراثیم ہمیشہ کے لئے مر جاتے ہیں

اگر کسی جفاکش راست باز آدمی کو سُست اور خود فروش بنا کر اخلاقی موت کا شکار کرنا ہو تو کسی دولتمند کو اسکا مربی بنا دو۔ پھر دیکھو اسمیں شخصی اعتماد کی روح کس طرح سلب ہو جاتی ہے۔ چاہو تو آزما لو"

زبیری نے اس فلسفہ حیات کے مفسر کی تقریر کو بڑے تحمّل سے سُنا اور نظر بچا کر اسکا منہ چڑا دیا۔ میں اس ڈرامے کو دیکھ کر محوِ حیرت تھا زبیری نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "آپ بھی تو دارالشہرت کے عازم معلوم ہوتے ہیں" اور مجھے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ موٹر کار میں ہمارے شاعر کے بالمقابل ایک چھریرے بدن کا خوش شکل جوان اور ایک انسانی ہیکر میں دراز قامت کوہ وقار دیو تمام سیٹ کو گھیرے بیٹھا تھا۔ حکیم دونوں کا آشنا معلوم ہوتا تھا علیک سلیک کرتے ہی اُن کے درمیان دھس کر بیٹھ گیا۔ اور ہمارے خاموش شاعر کا معتقد زبیری اپنے استاد کے ساتھ مؤدب ہو بیٹھا اور مجھے اُس نے پاس بٹھا لیا۔ چونکہ مسافر پورے ہو چکے تھے۔ اس لئے شوفر حسب قرارداد میرے بیٹھنے پر معترض نہ ہُوا ٭

حکیم نے دیو قامت آدمی کا شاعر سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "آج کل یہ ہندوستان میں اپنی طرز کے تنہا مبلّغ اسلام ہیں۔ آپ کو مباحث لاطائل سے نفرت ہے۔ لیکن وعظ میں ایسا دلپذیر انداز ہوتا ہے۔ کہ سامعین کو اپنی سحر بیانی سے نقش بر دیوار بنا دیتے ہیں" دوسرے صاحب کے متعلق معلوم ہُوا کہ وہ پہلے ہندی فلاسفر ہیں۔ جنھوں نے مذہب کو فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا ہے ٭

موٹر کار تیز چل رہی تھی اسلامی مبلغ نے روح فرسا نگاہ سے زبیری کی

گھور کر طنزیہ لہجہ میں دریافت کیا۔ کہ آجکل آپکا کیا شغل ہے۔ زبیری نے بہت سنجیدہ چہرہ بنا کر جواب دیا۔ "جب تک میں آپ کے ساتھ رہا۔ مجھے بھی مذہب کی متعدی بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ چونکہ آپکی مجلس انتظامیہ نے سیاست مذہبی میں میری نہاں کارگذاریوں کو حسب قرار داد نگاہِ اعتماد سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور قدر ناشناس گروہ میں میری جان سپاریوں کا عوض احسان فراموشی اور محسن کشی سے دیا جانے لگا۔ پس مجبوراً مجھے بھی آپکی منافقت آموز تلقین سے یکسوئی اختیار کرنی پڑی"۔

مبلّغ نے جگر دوز آواز میں جھلا کر کہا۔ "کیا کہتے ہو ہماری تعلیم منافقت آموز تھی؟ ہم تو دنیا میں منافقت کا قلع قمع کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمنے تو اپنی زندگی ہی تبلیغ کے لئے وقف کر دی ہے۔ دیکھو تم نے جورو بچّوں کی ذمہ داری کبھی اپنے سر نہیں لی۔ تم نہیں سمجھ سکتے دل پر صبر کا پتھر رکھ کر اہل و عیال کو اللہ کی راہ میں چھوڑ دینا کتنے دل گردے کا کام ہے۔ تم نے ہمیشہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کی ہے۔ تم کیا جانو رستے بستے گھر پر دولت و منصب پر لات مار کر فی سبیل اللہ تارک وطن ہونے کے لئے کسقدر ایثار کی ضرورت ہے۔ ظالم انسان کیا یہی دُنیا میں تبلیغ منافقت کے لئے گھر پھونک تماشا دیکھ رہا ہوں"۔

زبیری "حضرت سُنتا ہوں مغرب کے بڑے بڑے توحید شکن دہریئے جب آپ کے سامنے مسائل حیات کے متعلق اپنا علم ظاہر کرتے ہیں تو آپ یہ کہکر کہ یہ تو عین اسلام ہے۔ اُنہیں داخل اسلام فرما لیا

کرتے ہیں۔"

مبلغ "العظمت للہ! مجھے تو مغرب میں جا کر اُن لوگوں کے درمیان رہ کر معلوم ہوا ہے۔ کہ وہ لوگ یزداں شناسی کے بھوکے ہیں لیکن مذاہب پرست لوگوں نے باطل مسائل اختراع کر کے خارج از عقل توہم اور لاطائل تاویلوں سے اُن کے دلوں میں تمہارے خدا اور تمہارے مذہب کے متعلق نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ کچھ تو تمہارے کفر نواز علماء کی بدولت کچھ دشمن اسلام پادریوں کے تعصب کے طفیل۔ اسلام کے متعلق ایسے ایسے خیالات ان کے دل میں جاگزیں ہو گئے ہیں۔ کہ اصل اسلام کے سمجھنے سے وہ کہیں دُور جا پڑے ہیں۔ تم جانتے ہو۔ اسلام تو عین فطرت انسانی کے مطابق مذہب ہے اسلام ہم سے فوق الفطرت عبادات کا طالب نہیں۔ خلافِ عقل مسائل منوانا نہیں چاہتا پس میں تو اُن لوگوں کو یہی سمجھاتا ہوں۔ کہ اسلام اور نیچر ایک ہے اور جب وہ لوگ اپنے سیدھے سادھے فطری خیالات کا اظہار میرے روبرو کرتے ہیں۔ تو لامحالہ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ تو عین اسلام ہے"

فلاسفر (تیوری پر بل چڑھا کر) "قطع کلام ہوتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کا طریق تبلیغ بہت دلپسند ہے۔ آپ اپنے مذہبی مسائل پر دیگر علماء کی طرح نہیں اڑتے۔ بلکہ مذہبی نبرد آزمائی میں اگر پیچھے پاؤں تلے دلدل پاتے ہیں۔ تو چند قدم پیچھے ہٹ جانے میں مذہبی ہتک نہیں سمجھتے۔ یہ چال حریف کو عاجز کرنے میں کارگر ہوتی ہے کیونکہ وہ آپ کو پسپا ہوتا دیکھ کر پہلے تو بے تحاشا آپ کا تعاقب کرتا ہے اور پھر خود ہی اس دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ غالباً اسی [illegible]

نے زود کاری سے منافقت رکھ دیا ہے۔ بادی النظر میں اسلام کو سائنس کے مطابق بتانا بڑے دعوے کا اعلان ہے۔ مگر مسائل جزا و سزا کی توضیح بہشت و دوزخ کا تصور خارقِ عادت معجزات پر یقین اور اللہ تعالےٰ سے مکالمہ و مکاشفہ کی کیفیات کا سائنس کی تعلیم کے مطابق ہونا محال قطعی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا خدا تو بمقتضائے عمر معجزات کے سحر آفرین کرتبوں اور انبیا سازی کے کرشموں سے سیر ہو گیا ہے۔"

مبلغ "یہی تو خدا کا مجھ پر خاص فضل ہے کہ جن مسائل کی توضیح میں علماء جز بز ہو کر گالیوں پر اُتر آتے ہیں۔ ان مسائل کو براہین قاطع سے واضح کرتا رہا ہوں۔ چنانچہ "وفات مسیح" "معراج" "ضرورت انبیا" "امکان معجزات" جیسے پیچیدہ مسائل پر تو میرے مبتدی شاگرد بھی ہر ایک کی تسلی کر سکتے ہیں۔ ہمارا تو اب بھی علیٰ رؤس الاشہاد یہ اعلان ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی صفات میں ازلی و ابدی ہے۔ عام مسلمانوں کے خیال کے مطابق وہ گونگا نہیں ہو گیا۔ اب بھی تزکیۂ نفس کے مراحل طے کر کے اسلاف کی مانند شرف مکالمہ حاصل ہو سکتا ہے۔"

فلاسفر "یہ تو آپ نے ایسی بحث چھیڑ دی۔ جس کا تصفیہ موٹر کی بادپیما سواری میں ہونا مشکل ہے۔ میں تو آپ کی تمام تحریرات مطالعہ کر چکا۔ اب تک امکانِ معجزات کا ہی پتہ نہیں چلا۔ اگر مان بھی لیا جاوے۔ کہ بیسویں صدی کے سائنس کے انتہائی نتائج انبیا پر بالقائے ربانی ہویدا ہو جایا کرتے تھے۔ تو انہوں نے اپنے سریع الحصول علم کے ذریعہ جہلا کو شعبدہ بازی سے کیوں مرعوب کرنا چاہا۔ اگر آپ یہ دلیل دیں کہ جہالت کے زمانہ میں عوام کو خارقِ عادت معجزات ہی اللہ تعالےٰ کے قادر مطلق

ہونے کی بہترین دل نشیں دلیل ہو سکتے تھے۔ تو پھر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانے کے انبیا بلا غیر کسبی معجزات کے جو محض مراعاتِ خداوندی کے باعث اُن سے ظاہر ہو سکتے تھے۔ آج کل کے معمولی ماہرِ سائینس دہریہ سے جو علے الرغم خدا ویسے ہی معجزات قوانین قدرت کے ماتحت ہوکر کر سکتا ہے۔ کم حیثیت رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ سائینس دان دہریہ تو اپنے عملیات کا قوانین قدرت کے ماتحت ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اور ہر ایک کو اپنا طریق عمل سمجھا بھی سکتا ہے۔ مگر انبیا حالانکہ معجزات تو سراسر دیر فہم قوانین فطری کے مطابق کرتے رہے۔ لیکن سادہ لوح جہلا کو یہی ذہن نشین کراتے رہے ہیں کہ وہ تمام معجزات قوانین قدرت کی سراسر خلاف ورزی کر کے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالے اپنے بعض نشانات کے متعلق معین وقت کی اطلاع اپنے پیغمبر کو دے دیا کرتا تھا۔ جیسے کہ رسالت مآب کو چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا وقت تو ایک ماہر منجم کی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ پس جناب نے اپنے علم سے فائدہ اٹھا کر عین اُسوقت معین پر انگشت مبارک سے اشارہ کیا۔ جس سے لوگ یہ سمجھے کہ جناب کے حکم سے چاند شق ہو گیا۔ حالانکہ آپ نے ایک حادثے کی خبر پا کر ٹھیک اُس ساعتِ مقررہ پر اشارہ فرما دیا۔ یعنے نعوذباللہ حضرت صلعم نے لوگوں کو ایسا دھوکہ دیا۔ جو خدا کی نگاہ میں بھی مقبول ہو گیا۔ اور اللہ تعالے نے اجرام فلکیہ کے معمولی حوادث میں سے ایک کے متعلق دجل خفی کو جائز قرار دیا۔ کس لئے؟ اسی لئے تاکہ اس کے مہتمم بالشان رسول کی صداقت کا لوگوں کو یقین ہو جائے۔ کیا حضور سرورِ کائنات کا روزمرّہ کا چلن اور ہر فعل میں الٰہی منشاء کی تلاش ان کی صداقت کی کافی اور صریح

دلیل نہتھی۔ علاوہ ازیں ایسے بڑے واقع کی خبر کا تو آج سے تیرہ سو سال کے زمانۂ قریب کے مصر۔ یونان۔ عجم و ہندوستان جیسے مہذب ممالک کے باخبر منجموں کے ذریعہ حوالۂ تاریخ ہونا ضروری تھا۔ تاریخ میں اس واقع کے عدم ثبوت کے باعث آپ اپنے خصوصی انداز میں تاویل فرما سکتے ہیں۔ کہ ایک خاص گروہ کو ڈرانے کے لئے یہ واقعہ محض اس گروہ کی نظر فریبی تک ختم ہو گیا تھا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ عملِ شعبدہ کاری تو محض قوائے باصرہ پر کیا گیا۔ اور خوش اعتقاد لوگوں کو نظام شمسی میں در اندازی کرنے کی قدرت رکھنے کا یقین دلایا گیا۔

"یہ تو ایسے معجزات ہیں جن کی بنا پر آپ اکثر اسلام کے سائینس کے عین مطابق ہونے کی دلیل میسر کیا کرتے ہیں۔ لیکن حضرت نوح کے شعلہ خیز تنور سے طوفان انگیز آب ریزی۔ حضرت ابراہیم کی آتشین گلزار سے شرارہ چینی۔ حضرت سلیمان کی ہوائی تاخت۔ حضرت یونس کا شکم ماہی میں نقل مکان یا حضرت موسٰی کی اژدر آفرینی کو سائینس سے کیا نسبت ہو سکتی ہے"۔

مبلغ۔ (دونوں ہاتھوں سے اپنے پھیلتے ہوئے سینے کو دبا کر رخسار اور جبین کے بے شمار شکنوں سے چہرے کی ہئیت مخاطب کو خوف زدہ کرنے کے لئے بگاڑ کر) آپ انسانی محدود عقل سے خدا کے غیر محدود اسرار کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کی ورا الورا ہستی کو کما ینبغی طور پر سمجھنے کے لئے بھی انسان کی محدود عقل ناقص ہے ہم کو تو فقط اپنی روحانی احتیاجات پوری کرنے کے لئے عقل ودیعت کی گئی ہے۔ اور تعلق عبودیت کو سمجھنے اور استوار کرنے کے لئے ہماری مختصر

دانش کافی ہے۔ لیکن کسی چیز کے متعلق فقدانِ علم اس کے عدم وکذب کی دلیل نہیں ہو سکتا۔"

زبیری :- "میں تو ہمیشہ یہ پیٹتا رہا ہوں کہ انبیا کی صداقت کی دلیل معجزات یا پیشگوئیوں کو قرار دینا ہی غلطی ہے۔ پیشگوئیوں کے متعلق تو مجھے یقین ہو چکا ہے۔ کہ یہ صداقت منوانے کا ایسا خطرناک ہتھیار ہے۔ جو مجھ جیسے فدا کار مرید کے ہاتھ میں آ کر ہر نئے حادثہ پر منذر کی صداقت منوانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص جس فن میں اسے استغراق ہو مستقبل کے متعلق اپنے کمال کی بنا پر دعوے کر سکتا ہے۔ اور ایسا دعوے ایک حد تک درست ہونے کے باعث پیشگوئی کا رتبہ رکھتا ہے۔ عارف باللہ بھی الٰہیات میں کمالِ استغراق کے باعث جذبانی کیفیات کے ماتحت کچھ مبہم سے اشارات کر دیا کرتے ہیں۔ جو مریدوں کی عقل و دانش کی طفیل پیشگوئی کا رتبہ حاصل کر کے صداقت کی بیّن دلیل قرار پا جاتے ہیں۔ میں جامے میں پھولا نہیں سمایا کرتا تھا۔ جب روزمرہ کے حوادث میں سے کسی ایک پر میں ہمہ گیر پیش گوئی کا صحیح اطلاق ہوتا دیکھ لیتا تھا اور اسے اپنے مرشد کی دلیل صداقت قرار دیکر نشر مطالب میں سعئ بلیغ کیا کرتا تھا۔ ہر ایسے واضح نشان کے میسّر آنے سے میرے مذہبی خلوص میں ہیجان عظیم کا واقع ہونا فطری امر تھا لیکن میں اکثر عجیب خلجان میں پڑ جاتا تھا۔ کیونکہ جب میں کثیر المعانی پیشگوئی کی وضاحتِ ہنگامی سے اپنے عقاید کی سچائی کی دھاک بٹھا چکتا تھا۔ تو فوراً ہی ایک بزرگ تر سانحہ گذشتہ حل شدہ پیشگوئی کی عمدہ ترین وضاحت میں واقع ہوتا تھا۔ [illegible] مجھے [illegible] کہ

اعلان پر مہر سکوت لگا کر نئے حادثہ کی بنا پر فلک بوس مینار صداقت استوا کر کے بھولے بھٹکوں کو دشتِ ضلالت سے دارالامان کی جانب لانیکی فکر ہوتی تھی لیکن حضرت الحمد للہ اب تو میں مذہبی بیماری سے مدت ہوئی شفا پا چکا ہوں۔ البتہ منافقت کا نسخہ آپ کے فیضان سے ایسا حاصل ہوا ہے۔ کہ جہاں جاؤں میرا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میرے استاد تو مجھے مفتن سمجھ کر کانپتے ہیں۔ اور نیک بخت مبتلائے مذہب مجھے مخلص جان کر میرا احترام کرتے ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ غیر متعصب سیاں منافقت ہر شخص کی بقا کے لئے ضروری ہے"۔

حکیمؒ بہتر ہو کہ اس نازک بحث کو یہیں ختم کیا جائے میں فلاسفر صاحب کی بڑی قدر اس لئے کرتا ہوں۔ کہ یہ ہندوستان میں مغربی طرز کے پہلے آدمی ہیں۔ جنہوں نے دنیاوی دریوزہ گری سے کنارہ کر کے محض دماغی جدوجہد سے تصنیف و تالیف کو ذریعۂ معاش قرار دیا ہے۔ آج کل تو کسی پر دہریت کا الزام لگانا اسکی ہتک کرنا ہے۔ کیونکہ اب تو پرانے دہریئے بھی خدا پرست ہو گئے ہیں۔ ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و مشرب کا ہو متشکک یا اگناسٹک ہونا ضروری ہے جو شخص تحقیق سے کچھ حاصل کرنا چاہے اُسے دورانِ تحقیق میں بالکل اگناسٹک کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ ورنہ جو تحقیق کہ ایک مسئلے کے متعلق اثبات و صداقت کے دلائل بہم پہنچانے کی نیت سے کی جائے محقق ابتدائے تحقیق ہی سے جادۂ دیانت سے منحرف کر دیتی ہے اور ایسا آدمی کبھی کسی مسئلے کو طبعی طور پر (Scientifically) حل نہیں کر سکتا پس فلاسفر صاحب کے اعتراضات سے مذہبی مسائل سے انکار قطعی لازم

نہیں آتا۔ بلکہ خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک شخص دماغی استبداد
سے آزاد ہو کر چند حل طلب مسائل علمائے امت کے اجتہاد کے لئے
پیش کرتا ہے۔ لیکن آج کل تو سب سے نرالا کام فلاسفر صاحب کا
ڈراما نویسی کی طرز میں شروع ہوا ہے۔ اس سے بیشتر چند لوگوں نے
ناول نویسی کی طرح ڈالی۔ لیکن بجائے اُردو علم ادب میں کچھ اضافہ
کرنے کے اپنی ادھوری کوششوں سے زبان اردو کو ناول کے لئے
ناقابل ثابت کر دیا۔ اگر شرر و سرشار کے ناول ہمیں میسّر نہ آتے تو
ہم کہہ سکتے تھے کہ اردو میں ناول لکھا ہی نہیں گیا۔ البتہ اگر مرزا محمد سعید
صاحب کو افکارِ روزگار اجازت دیں تو وہ اس وقت بہترین ناول نویس
بن سکتے ہیں۔ احسنؔ و حشرؔ کے ڈراموں کی غالباً اس لئے قدر نہیں
ہوئی کہ اوّل تو ہندوستانی ابھی تک ڈراموں سے اخلاقی سبق حاصل کرنے
کے قابل نہیں ہوئے۔ دوم اُن کے ڈراموں کا بیشتر حِصّہ انگریزی ڈراموں
کے تراجم اور اقتباسات پر مشتمل ہے آغا حشر کے ڈراموں کی قدر وہی
کر سکتے ہیں جنہوں نے اُن کے ڈرامے سٹیج پر ہوتے دیکھے ہیں۔ ورنہ
آغا صاحب کو تو اپنی تصنیفات کے حفظِ مواد کا اسقدر خیال ہے کہ اُن کے
کسی ڈرامے کا ہم تک پہنچنا ہی محال ہے۔ فلاسفر صاحب کے ڈرامے
ہندوستان کی مذہبی سیاسی اور معاشرتی جدوجہد کا صحیح نقشہ ہونگے۔
بلکہ وہ واقعات سے گذر کر خیالات کی نقشہ کشی کریں گے جس کی اس وقت
تک کمی تھی۔"

زبیری "میرا تو خیال ہے۔ جب تک ہمارا نسوانی لٹریچر ترقی نہیں کریگا
خواہ ہم علوم مغربی میں کتنی استعداد بہم پہنچالیں۔ ہماری اخلاقی حالت میں

متانت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ مینے تو اپنی زندگی ترقی تعلیم نسواں کے لئے
وقف کر دی ہے میں ایک ایجنسی انگریزی طرز پر قایم کرنے والا ہوں۔
جو کچھ معاوضہ دے کر محدود سے چند تعلیمیافتہ مستورات کو تصنیف کا
شوق دلائے اور انکی تصانیف کو خرید کر خود شاعت کرے۔ مجھے تو
اپنی زندگی میں دو اَن پڑھ بیویوں سے ایسا بُرا سابقہ پڑا ہے کہیں نے
قسم کھالی ہے کہ جب تک ادبی مذاق رکھنے والی بیوی میسر نہ آئے۔ میں
ہرگز شادی نہیں کرونگا۔ میرے نصف درجن دوست اس وقت اللہ کے
فضل سے اعلےٰ تعلیمیافتہ صحیح مذاق رکھنے والے یا تو اپنی سودیشی بیویوں سے
نالاں یا بیوی کی آرزو میں مر رہے ہیں۔ اب جبتک ان کے لئے ایک ست
تعلیمیافتہ بیویوں کا میسر نہ آئے۔ مجھے ان کی بے مزہ زندگی کا تصور سوہان
روح ہو رہا ہے جسقدر تصانیف میں اب تک جمع کر سکا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ اگر مستورات کو باقاعدہ اعلےٰ تعلیم دلائی جائے۔ تو ادبی دنیا میں کیا بلحاظ
شاعرہ اور کیا بلحاظ نثارہ مردوں سے پیچھے نہیں رہینگی"۔

حکیم:- آجکل اُردو شاعر نثر لکھنے والوں سے زیادہ ملتے ہیں۔ کیونکہ
اُردو شاعری قافیہ پیمائی پر آٹھہری ہے۔ اُردو شاعری کو آپ جہاں تک
ہوسکے اپنے دوستوں میں رائج ہونے سے روکیں کیونکہ جب تک یہ جوہر
کسی کو اللہ کی طرف سے عطا نہ ہو۔ مشق سے شاعر بننے کی کوشش کرنا
حماقت ہے۔ اُردو میں آجکل خیال آفریں شاعر فقط ایک ہی ہے۔
مینے شاعری میں جو کچھ حاصل کیا ہے۔ اسکے تتبع سے ہے شاعر کا رُتبہ
کارلائل نے پیغمبر کے برابر قرار دیا ہے۔ کیونکہ حقیقی شاعر بھی پیغمبر کی طرح
قوموں کے اخلاق واطوار اور تہذیب و تمدن میں انقلاب عظیم پیدا کرنے

کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ ہر ایک حقیقی شاعر الہٰی پیغام لے کر آتا ہے۔ جب تک وہ پیغام اپنی قوم تک نہ پہنچا دے اسکی طبیعت بے چین رہتی ہے۔ شاعر اپنے کمالِ فن کے لئے دیگر اہلِ قلم کی طرح محتاج مربی نہیں ہوتا۔ امراء و رؤساء کی مدح سرائی کرنے والے ریزہ چین مصاحبین پر شاعر کی اصطلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ شعر کی قیمت جب بازار میں پڑنے لگے۔ تو شاعر پیغامبر کے رتبے سے گر جاتا ہے میرے اُستاد نے آجتک کسی کی مدح سرائی نہیں کی۔ اس خدائی دین کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کبھی حصولِ شہرت کے لئے شعر نہیں کہے۔ کبھی فرمائشی غزل نہیں لکھی۔ کیونکہ اس میں آمد نہیں رہتی۔ جب بھی کچھ کہا ہے بالقاے ربانی کہا ہے۔ اسلئے انکا کلام رطب و یابس سے بالکل پاک ہے۔ طرحی غزلیں لکھنے کے وہ مخالف ہیں۔ کیونکہ اس طرح شاعری کا اصلی مدعا مفقود ہو جاتا ہے۔ طرحی غزل کہنے والا شاعر کے ارفع مقام سے اتر کر ادبی مزدور رہ جاتا ہے۔ شعر تو ایک نغمۂ خیال ہے جو دل سے اُٹھ کر دماغ کے رستے زبان پر آتا ہے۔ حسیاتِ قلبی پابند فرمائش نہیں ہوتیں نہ دادِ تحسین سے ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور نہ قدر ناشناسی سے ان کی موت ۔

"شاعر کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ آیندہ نسل کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس کے معاصرین اسکا کلام سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے اور شاعر ان کی تحسین سے بے نیاز۔ تم غور کر کے دیکھ لو دُنیا کے بڑے بڑے شاعر دورانِ حیات میں ناقدری کا شکار ہوئے۔ یا شہیدِ حسد۔ آیندہ نسلوں نے اُنہیں قعر گمنامی سے نکال کر ملاء اعلےٰ

میں جگہ دی۔ شاعر ملہم کی حیثیت میں قوم کے لئے وہ نصب العین پیش کرتا ہے۔ جسے اس وقت کی تہذیب و تمدن سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ اسلئے وہ عوام کے لئے نامقبول ہوتا ہے اور شاعر بے جا نکتہ چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری ہی پشت کو اقوام عالم میں زندہ رہنے کے لئے وہی مرے ہوئے شاعر کا نصب العین اختیار کرنا پڑتا ہے اور اس وقت مرحوم کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ ؎

بے نیاز از گوش امروز آمدم
من صدائے شاعر فردا ستم

لیکن میں تو کہتا ہوں۔ شاعر کی عظمت اسکی زندگی ہی میں معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی معنی آفرینیوں کا مقابلہ نکتہ چینیوں کی ہرزہ سرائی سے کر کے دیکھ لو۔ زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اگر یقین نہ ہو تو آزما دیکھو"

حکیم کی تقریر سن کر ہمارے خاموش شاعر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور میں نے دیکھا تو اُسکی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ وہ یکبارگی غش کھا کر میری گود میں آ گرا۔ اس دھماکے سے میرا سلسلۂ خیال بھی ٹوٹ گیا۔ آہ حسرت نصیب شاعر تیری موت ہی تجھے زندہ جاوید کرے گی۔

آج سے ہزاروں سال پیشتر جبکہ عالم ارواح میں نغمہ طراز فرشتوں سے کیفیات ارضی سُنکر رقص کیا کرتا تھا۔ میرے دل میں بھی آرزو ہُوا کرتی تھی۔ کہ قیدِ جسدی میں گرفتار ہو کر میں بھی سوانحہ حیات کی لذتوں سے آشناء ہوں۔ میں اس کرۂ لاہوت کے نگہبان فرشتوں کو رشوتِ رقص دے کر اس جنت ارضی کی (جسے اب دُنیا سے موسوم کرتا ہوں) سیر کی اجازت لے لیا کرتا تھا۔ میری پرواز ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں اور قاف کی عشق آفرین گھاٹیوں تک محدود رہا کرتی تھی۔ پہلے مقام پر میرا ہیجانِ یزداں شناسی مجھے دیوتا پرستی کے فریبِ ہمہ اوست میں محو کر دیا کرتا تھا۔ اور دوسرا مقام جسے حُسن کا آماجگاہ کہنا چاہئے میرے استغراقِ مذہبی کو حورانِ سفلی کی صورت میں متشکل کر دیا کرتا تھا ؛

کبھی کبھی میں خانہ بدوش لیلےٰ قصر نشین شیریں اور بیوقوف مگر شوخ لڑکی "ہیر" کے جولانگاہوں کی سیر کو نکل جاتا تھا اور مقامی روایات سے متاثر ہو کر ربِّ سرمد سے دُعا کیا کرتا تھا۔ کہ میرا ہبوطِ آخری کسی ایسے ہی مقدس مقام پر ہو۔ میری عالم معصومی کی دعائیں منظور ہوئیں اور مجھے عالم ارواح سے زندانیٔ پیکر کر کے جھنگ سیال کے مقام معروف پر بھیجا گیا۔ میری پرورش کے لئے سیال قوم کی عورتیں مقرر کی گئیں میں احساسِ

عشق کے ساتھ بچپن کی معصومیت کی آڑ میں سیال کے فرقہ نسائی کے ساتھ غیر معمولی اُنس ظاہر کیا کرتا تھا۔ اور خانوادۂ ہیر کی ہر ایک عورت کی گود میں تعلیم وفا لینے کے لئے اُچھل اُچھل کر جایا کرتا تھا۔ مجھے اپنی والدہ سے آجکل کی طرح اس وقت بھی خوفِ ادب دور رہنے کیلئے مجبور کرتا تھا۔ اور بچے ماں کی گود میں جنت سمجھا کرتے ہیں۔ لیکن میں والدہ کی پُرہیبت و ادب آموز رفاقت سے گھبرا کر نسلِ سیال کے بہشتی پہلو میں عشرتِ قلبی کے حصول کے لئے مچلا کرتا تھا۔ مجھے جھنگ سیال کی عورتوں نے جو شئے گھٹی میں پلائی۔ اس نے میری فطرتِ معنویہ پر ہمیشہ کے لئے مستقل اثر چھوڑ دیا +

مجھے احساسِ حیات کے ساتھ ہی احساسِ حُسن بھی شروع ہو گیا چنانچہ بچپن میں جبکہ شوخ وشنگ کِھلائی۔ مجھے تنہا چھوڑ کر دربان سے اٹکھیلیوں میں مشغول ہو جاتی تھی۔ تو میں صحنِ خانہ کے تمام گملوں میں سے خاردار پھول چُن لیا کرتا تھا۔ پھر ان کے گرد سے کانٹوں کو علیحدہ کر کے پھولوں کو کھلائی کی نذر کر دیتا تھا۔ جو پھولوں کو اپنی لمبی لمبی زلفوں میں※ نازک سی شاخ گل پر جھولتی ہوئی تیتری کو چٹکی میں پکڑ اس کے بدنما بھونڈے سے جسم کو اس کے باریک چمکیلے پروں سے علیحدہ کر کے فریب حُسن میں محو ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ حسین تیتری اسی وقت میری بچپن کی قربان گاہ پر ہلاک ہو جاتی تھی اور میرے ہاتھ میں سوائے باریک سی خاک کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مجھے جب ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کہ حُسن ناپائدار ہے اور یہ علم مجھے اس وقت بھی افسردہ خاطر کر دیا کرتا تھا +

ہر حسین شئے کو قبضہ میں لانے کے لئے میں اکثر مچلتا رہتا تھا۔ لیکن

※ باندھ کر شام تک مجھے گودی میں اچھالتی ہوئی تمام گھر میں مٹکتی پھرتی تھی۔ کبھی میں

احساسِ حُسن کے ساتھ مجھ میں جذبۂ ایثار ابھی پیدا نہ ہُوا تھا۔ بلکہ حسین شے کو توڑ پھوڑ کر اپنی بےچین طبیعت کو بہلایا کرتا تھا۔ آخر مجھ سے زبردستی میری قدرتی آزادی چھین کر مجھے مکتب میں جورِ اُستاد کی نذر کر دیا گیا۔ بوڑھے معلم کی شب و روز کی تلقین سے میرے دل میں بھی احساسِ خدمت پیدا ہوا اور اب میں چاہتا تھا۔ کہ کوئی شخص مُجھ پر ایسا قابو پائے۔ کہ اسکی خدمت مجھے منتِ اُستاد سے آزاد کر دے۔ کیونکہ میں دیہاتی اُستاد کی روزمرہ خدمت کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔ اُن حضرت کی فرمائش جو غالبًا عُسرتِ ذاتی کی وجہ سے ہُوا کرتی تھی۔ مجھے اکثر شرمندۂ ذرائع کرتی رہتی تھی۔ آخر میری دسویں سالگرہ پر میرے معلم اخلاق بزرگ نے مجھے ایک ہم مکتب سے تعارف کراتے ہوئے ہمیشہ اس کی صحبت میں رہنے کی فہمائش کی۔ پہلے تو میں دماغی کوفت دور کرنے کے لئے اپنے نئے دوست سے ملنا عشرتِ ذہنی کا موجب سمجھتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ میں روزمرہ کے سبق بلا رفاقتِ یار از بر نہیں کر سکتا۔ کچھ اُستاد کا خوف کچھ اشتیاقِ صحبت میں بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سے ملا کرتا تھا۔ آہ وہ میری زندگی میں غالبًا پہلا سابقۂ محبت تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں نامنقطع درسی رفاقت کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور مرتے وقت تک ہم یوں ہی یکجا تعلیم پاتے رہیں گے۔ گویا کہ ہمارے موجودہ نقشۂ محبت میں کبھی انقلاب واقع ہی نہ ہوگا۔ لیکن آہ اس کے والد کے انتقال نے میری زندگی کے پہلے دوست کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کر دیا۔ اب وہ میری بچپن کی جولانگاہیں مجھے ہولناک معلوم ہوتی تھیں۔ میں اس مقام سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میں یکساں سوگوار زندگی

سے تنگ آگیا تھا۔ میں اپنے کھوئے ہوئے دوست کی یاد کو حفظِ زندگی کے لئے دل سے بھلا دینا چاہتا تھا۔ آہ میں اپنی پہلی محبت کی یاد میں بے وفا ثابت ہُوا مگر میں قانونِ انقلاب سے مجبور تھا۔

بچپن کا محبوب کھو کر مجھے پہلی بار دُنیا کی بے ثباتی کا احساس ہُوا۔ اس سے پیشتر میں اپنے دوست کو بوجہ اس یقینِ عظمت و بزرگی کے جو کہ اس کے متعلق میرے دل پر نقش ہو گیا تھا اسے دُنیا میں غیر فانی وجود تصور کرتا تھا۔ اور بوجہ اس سے فوق الخیال عقیدت رکھنے کے اپنے ہی استغراق واہمہ کے سبب ضمنی طور پر اپنے تئیں بھی موت کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رستگار خیال کرتا تھا۔ درسی اوقات معینہ کے بعد بھی جب تفریح کی گھڑیاں اکٹھی گذرتی تھیں۔ تو خیال کرتا تھا۔ کہ اس وصالِ ادبی کا سلسلہ ہمیشہ یوں ہی جاری رہے گا۔ آہ جو دل کہ چڑیا چڑے کی کہانیوں سے بہل جایا کرتا تھا۔ اب اُس میں شعر پسند خواص پیدا ہو چلے تھے۔ میرے دوست کے والد کی موت نے مجھے پہلی مرتبہ انتخاب اشعار کی طرف متوجہ کیا اور جو پہلا انتخابی شعر مجھے اپنے اُردو کورس میں سے میسر آیا میں فراقِ یار میں کوہستانِ سرحد کی چٹانوں پر چیخ چیخ کر گایا کرتا تھا ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

مجھے خیال ہُوا کہ ہم دونوں بے مقدار ذرّے تھے۔ ایک جھنگ سیال کے سنگ ریزوں سے علیحدہ ہُوا اور دوسرا دہلی کے قلعہ سے آزاد ہو کر طوفانِ باد کے تھپیڑوں سے اُڑتے اُڑاتے دریائے کابل کے کنارے

پر آ گرے بارے حوادثاتِ زمانہ نے مہلت دی۔ اس تاریخی دریا کے شاداب کنارے پر سکونِ وصال میسر آیا۔ اتصال باہمی سے ایک نئی زندگی حاصل کی فریبِ عشرت میں محو ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے کہ قانونِ انقلاب نے طوفان خیز حربوں سے پھر آوارۂ فضا کر دیا۔

اب میرے حواس پر شدتِ بلا سے بیہوشی طاری ہو گئی۔ اگرچہ قانونِ انقلاب اپنا کام کر رہا تھا۔ لیکن قدرت نے مجھے کلوروفارم سونگھا دیا تھا میرے بدن پر عمل جراحی ہو رہا تھا۔ لیکن میں خواب مدہوشی میں فضائے لطیف میں پریوں کے رقص پیہم کا تماشا کر رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کب میں اس سرورِ غفلت سے بیدار ہوا۔ اور دنیا میری بیہوشی میں کس قدر بوڑھی ہو چکی تھی۔ بہرحال میں عنفوانِ شباب ہی میں تھا۔ دُنیا کی ہر حسین چیز مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ حُسن قدرت نے تمام عالم کو مقناطیس بنا دیا تھا۔ اور میں متضاد آرزؤں کا مقابلہ کرتا ہوا مجبورِ کشش ہو کر ہر لطیف شے کی طرف کھچا چلا جاتا تھا۔ اس تماشا گاہ عالم میں مَیں اس قدر آوارۂ نظر ہو چکا تھا۔ کہ قوتِ امتیاز مجھے جواب دیتی معلوم ہوتی تھی۔ نیکی و بدی دو مختلف الالوان کیفیات جذباتی تھیں نیکی کا رنگ پھیکا سا زردی مائل خاکستری تھا۔ بدی سُرخ خونی رنگ میں غلطاں تھی۔ اس رنگ میں حدتِ انسانی بلکہ شعاع آفتابی تک کو جذب کر لینے کی خاصیت بہت زیادہ تھی۔ میں بھی خواص فطری سے مجبور تھا۔ اگرچہ خیالی بحث مجھے نیکی کی عظمت کا قائل کرا دیتی تھی لیکن عملی زندگی پابندِ خیال نہیں تھی۔ میں جذبات کا غلام بن گیا تھا۔ مذہبی وجدان میرے دل سے قطعی محو ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں ہر چیز کو بوجہ حسن

انجام دینے کا آرزو مند ہوا کرتا ہوں لیکن مذہب کے پیش پا افتادہ مسائل میں استغراق کمال پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے میں اپنے دل میں سوچتا تھا۔ کہ اگر مجھ میں فنا فی اللہ ہونے کی اہلیت ہی ودیعت نہیں ہوئی تو میں فنا فی الجذبات کیوں نہ ہو جاؤں۔ اگر میں عابدِ شب زندہ دار نہیں بن سکتا۔ تو رندِ خرابا تی بن جانے میں کیا ہرج ہے۔ ارحم الراحمین حضرات مفتیان دین کی طرح ایسا تنگ دل تو نہیں کہ میری چند سالہ عشرتِ فطری کی سزا میں ہمیشہ کے لئے دوزخِ خیالی کا ایندھن بنا دے۔ غرضیکہ میں دل سے فیصلہ کر کے تلاش عیش میں نکل کھڑا ہوا۔ حوادث زمانہ اب بھی مجھے چین نہ لینے دیتے تھے۔ میں بیم و بلا سے بچتا ہوا ہر نئے مقامِ سکونت پر فکرِ آسائش میں سرگرداں پھرتا تھا۔ چند روز کی سعیٔ لاحاصل کے بعد مجھے علم ہوا کہ مزکی انسانوں کے ساتھ تو مجھے بُعدِ اصولی تھا ہی اربابِ ذوق بھی مجھے حریفِ عشرت نہ سمجھتے تھے۔ اب میری ایسی حالت تھی۔ کہ دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ‌‌•

اب میں اپنی زندگی کو بے اصول و لغو سمجھ کر اپنے دل میں کڑھا کرتا تھا۔ آہ یہ میرے ابتلا کا زمانہ تھا۔ آزمائش کے محل میں بے یار و مددگار شاخ کوہ پر کھڑا تھا۔ جہاں سے خفیف سی بادِ مخالف کی لرزش یا میری نشاطی لغزش مجھے ہمیشہ کے لئے ناپیدا کنار ظلمات مذلت میں گرا سکتی تھی۔ عین اس وقت ایک مزکی انسان بادلوں پر سوار ہوا میں تیرتا ہوا میری جانب بڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کے گرد و پیش کی جاندار مخلوق غیر ارادی جنبش کے ساتھ اس کی تعظیم کیلئے مجبور ہوتی تھی۔ میں یہ جلوس عجیب دیکھ کر ٹھٹکا پہلے تو میرے دل پر نووارد

کی پُرجلال شان سے ہیبت طاری ہوئی اور میں نے چاہا کہ ایک پھلانگ مار کر اپنی پُرمعصیت زندگی کا خاتمہ کردوں۔لیکن جب میری نگاہ اس کی فسوں پرور آنکھوں پر پڑی۔ تو میں بھی دیگر ذی روح نظر بندوں کی طرح مسحورِ نگاہ ہو گیا +

اس بوڑھے نوجوان نے ابروئے چشم کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بُلایا۔ مَیں نگاہ زمین پر گاڑے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اسکی جانب بڑھا۔ آہ میرے پاس سوائے ہجومِ افکار کے اور کوئی ہدیۂ نیاز نہ تھا۔جو میں اس کے حضور پیش کرتا۔ میں بزمِ جہاں سے اپنے تئیں راندہ ہوا سمجھتا تھا۔اس صالح انسان کی شفقت نے مجھے پھر دنیا والوں میں شامل کر دیا۔ اس کے محبت افروز لہجہ سے میری آنکھوں سے اشک ترنم جاری ہو گئے۔ اب میں شب و روز اس کے تقوے آموز درسِ اخلاق سے کسب فضائل کیا کرتا تھا۔ اس کی غیر معمولی التفات نے میرے دل سے احساسِ خانہ بدوشی کو بالکل زائل کر دیا تھا۔ مگر انقلاب روزگار کے ہاتھوں جو سبق میں نے حاصل کیا تھا۔ مجھے اِس بات پر مجبور کرتا تھا۔ کہ اِس ہنگامِ وصال کو مہلتِ قلیل سمجھ کر اس مبداء اخلاق سے بحدِ امکان حصول تقوے میں مبالغہ کیا کروں۔ اب معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری عقیدت ہموار سے اس کے دل میں بھی میری محبت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی توجہ سے مجھ میں حُسن تو پیدا نہ ہوسکتا تھا البتہ میں شتر غمزوں کا عادی ہو چلا تھا۔ اور وہ مردِ خدا میری تمام بے اعتدالیوں کو میری دلدہی کی خاطر برداشت کرتا تھا +

میں اس مقام پر اپنے مختصر سے کارواں کے ساتھ اجنبیوں کی

سی زندگی بسر کرتا تھا۔ جب تک اپنے مکان پر رہتا تھا۔ چند ایک بچے کھچے بوڑھے اور خوردسال عزیزوں میں حوادثاتِ ماضی کی یاد سے محفوظ رہا کرتا تھا۔ مرے ہوؤں کو صبر کر چکا تھا۔ پیکارِ حیات کے لئے ابھی تیار نہ تھا۔ کہ اس عرصۂ غربت میں موت نے مجھ پر ایک اور وار کیا اور اس گمنام قافلہ کا کارواں سالار ہم سب کو مسافر نواز ہمسایوں کا پابندِ مروّت کر کے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اس ہنگام بُکا و شیون میں مجھے اپنے لواحقین کو تشفی دینے کی فکر میں نالۂ غم بلند کرنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ اگرچہ میرے دل میں اس سوانحۂ جانگزا سے طوفانِ ملال اُمڈا لیکن بے نوا کارواں کی ذمہ واری کے تصور نے میری آنکھوں میں آنسو خشک کر دیئے تھے۔ میں فزونیٔ افکار کی وجہ سے بالکل خاموش تھا۔ لیکن وہ بزرگ منش انسان میرے درد سے آشنا ہو کر میرے ساتھ سائے کی طرح لگا ہُوا تھا۔ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اس مردِ خدا نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور ایک لرزۂ حیا کے ساتھ میرے خاک آلود بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے شانہ کرنے لگا۔ میں غم و اندوہ سے تھک کر ذرا غافل ہُوا ہی تھا کہ پیشانی پر گرم گرم قطراتِ اشک کے گرنے سے میری آنکھ کھل گئی میں حیران تھا۔ کہ اس محبت ناآشنا دنیا میں بھی ایسے آدمی موجود ہیں جو دوسرے کے غم سے متاثر ہو کر مبتلائے شیون ہو سکیں۔ اس کی اسقدر ہمدردی نے اس ہنگامِ بلا میں میرے دل میں مقابلۂ مصائب کی ہمت پیدا کر دی۔ مگر آہ پیکارِ حیات میں شامل ہونے کے لئے مجھے سب سے پہلے اپنے درد آشنا حبیب سے جدا ہونا پڑا۔ اس نے مجھے رخصت

کرتے وقت خطبۂ بلیغ میں رموزِ حیات سے آشنا کرنے کی کوشش کی اور رقت خیز دعا کے ساتھ مجھے حادثاتِ زمانہ کے سپرد کر دیا۔

میں اپنے چاہنے والے دوست اور محتاجِ شفقت عزیزوں سے رخصت سفر لے کر بلا زادِ راہ فراہم کئے نکل کھڑا ہؤا سیل زمانہ کے بہاؤ پر بہتا ہؤا مقامِ ماضی سے بہت دور نکل گیا۔ لیکن طوفانِ حیات مجھے دم نہ لینے دیتا تھا۔ آخر ایک پُر رونق بستی میں میرا گذر ہؤا۔ کچھ توبشش نظر سامان نشاط سے متاثر ہو کر۔ کچھ سکون عارضی میں محفوظ ہو کر یہنے رخت سفر وہیں کھول دیا۔ لیکن مجھے اپنے عارضی قیام میں معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اُن ساکنانِ خطۂ تہذیب اور مجھ صحرا نورد بینوا میں عادات و اخلاق خو بو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے دیکھا۔ کہ میں جدھر سے گذرتا تھا۔ اُنگلیاں میری طرف اُٹھا کرتی تھیں۔ میری وضع قطع پر اشارات ہؤا کرتے تھے۔ میرے دقیانوسی تراش کے کپڑے اس بستی کے زرق برق ملبوس کے انسانوں کی نگاہ میں نہ جچتے تھے اور وہ مجھے عجوبۂ روزگار سمجھ کر تحیر و استعجاب سے دیکھا کرتے تھے۔ میں ان کی تیز و نقادانہ نگاہ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اور نگاہ زمین پر گاڑے اپنے خیالات میں غرق اپنی سراسیمگی و پریشانی کو چھپاتا ہؤا پاس سے نکل جاتا تھا۔ لیکن میں اس مہذب گروہ کا بڑا شکر گذار ہوں۔ کہ باوجود مبتلائے حیرت ہونے کے جیسے کہ ان کے قیافہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ وہ پابندِ اخلاق معلوم ہوتے تھے۔ کنایتاً خاموش تنقید خواہ کسی قدر کرتے ہوں۔ لیکن زبان پر حرفِ استہزا نہ لاتے تھے۔

اگرچہ یہ شہر اپنی رونق و چہل پہل میں لاثانی تھا اور ہنگامۂ پیکارِ

زیست بھی یہاں بہت تیز و تند تھا۔ لیکن اس ساری گہما گہمی میں فقط میں خاموش سایہ کی طرح تنہا چکر لگاتا رہتا تھا۔ کیونکہ میرا اس ہجوم خلائق میں کوئی واقف نہ تھا۔ جب میں شام کے وقت کسی باغ میں گذرتے ہوئے دو دو چار چار آدمیوں کی جماعتوں کو مصروفِ سیر دیکھتا تو میرے کلیجہ پر رشک کی وجہ سے سانپ لوٹ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے تنہا آتے دیکھ کر شاید اقرارِ نعمت کے طور پر ایک دوسرے کے گلے میں بازو حمائل کر دیتے تھے اور لوچدار قہقہہ لگاتے ہوئے روشوں کو پامال کرتے میرے پاس سے اٹکھیلیاں کرتے گذر جاتے تھے۔ آہ یہ وطن پرست گروہ میرے احساسات کی قطعی پرواہ نہ کر کے اپنے شہر کی تفرج گاہوں کو اپنی محبّت افروز گلگشت سے زیادہ پُر فریب بنا کر میرے دل کو جلاتے تھے اور خود خوش ہوتے تھے۔ میں انکے بین القلوب تعلقات کا اندازہ ان کے باہمی ربط سے لگا کر اپنے کھوئے ہوئے دوستوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا اور کہتا تھا کہ "اے جورِ زمانہ سے ناآشنا غافلو! عنقریب برقِ مفارقت تمہارے خرمنِ محبّت کو خاک سیاہ کر دیگی۔ اور تمہاری اس وقت کی عارضی عشرتِ وصال تمہارے لئے ایک جاں سوز یاد سے زیادہ نہ رہ جائے گی۔ اپنے اس وقت کے تبسّم کا تصوّرِ محض تمہیں چشمِ پُرنم کر دیا کرے گا۔ پھر تم پر میری پُر ملال زندگی کا معمّہ کھُل جائے گا۔ تم جس خوابِ غفلت میں سرشار ہو میں اس خمار سے ہوشیار ہو چکا ہوں۔ تمہاری قسمت تمہارے سر پر کھڑی ہنس رہی ہے اور میں اپنی قسمت کو رو چکا ہوں۔ اللہ تمہیں آفاتِ زندگی سے محفوظ رکھے"۔

کبھی میں گھبرا کر دریا کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ تو وہاں بھی زندہ لوگوں کو شکار کرتے کشتی چلاتے نہاتے اور تیرتے دیکھ کر یاد ماضی میں میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ دریا میں کھڑے ہو کر دو دوست آب باری یا آب بازی کرتے ہوئے پانی کے مسلسل چھینٹوں سے ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرتے تھے۔ تو ان کی سطح آب سے پیہم گل اندازی مجھے خار گذرتی تھی۔ ہر شخص اپنی تفریح میں مشغول مجھے بیکار دیکھ کر خندۂ مسترحم کے ساتھ نگاہ پھیر لیتا تھا اور مجھے نشانۂ تغافل بنا کر خود تحصیل سرور میں لگ جاتا تھا۔ میں دل میں کڑھتا تھا اور کہتا تھا کہ "اے مغرور انسانو! تم خیال کرتے ہو کہ دریا اپنی سیمیں وسعت کیسا فقط اس کے شاداب کناروں پر بسنے والوں کے لئے جاری ہے یا چمنستان کی شادابیاں فقط شہریوں کے حصے میں ہیں گویا کہ خانہ بدوش مسافر تمہاری تفریح گاہوں کو خراب کرنے تمہاری رونق کو نظر لگانے کے لئے یہاں آتے ہیں۔"

اس متمدن قوم کی ایک اور خصوصیت نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ میں مختلف ملکوں میں پھرا ہوں۔ لیکن وہاں کی بیشمار مرد آبادی کو دیکھ کر میں ہمیشہ گھبرا جاتا تھا اور سوچتا تھا۔ کہ اگر اسی قدر مستورات بھی جو پابند رسوم ہو کر گھر کی چار دیواری میں نظر بند کی گئی ہیں۔ یکبارگی گھروں سے نکل پڑیں۔ تو ایسے گنجان بازاروں کی دو چند آبادی ہو جانے سے کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ رہے اور مرد عورت کا ملا جلا ہجوم عجیب عالم پیدا کر دے اور ایسی حالت میں تو شائد مانوس زناں عورتوں سے عام بازاروں میں چلا بھی نہ جائے۔ چنانچہ وہی خیالی کیفیت

کسی قدر حسن ترتیب کے ساتھ مجھے اس بستی میں نظر آئی۔ باغ کی روشیں اور سبزہ زار چمن جنس لطیف کی موجودگی سے سونے پر سوہاگہ کا لطف دے رہے تھے۔ بازاروں میں گل فروش لڑکیاں۔ دوکانوں پر میوہ فروش عورتیں۔ کارخانوں میں منتظم خواتین۔ سیرگاہوں میں نازک پیکر حوریں مردانہ آبادی کی وحشت اور کھردرے پن پر پردہ ڈال رہی تھیں۔ پہلے پہل تو یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے وہاں کے باشندوں کے اخلاق پر شبہ گذرا۔ مگر چند روز ان میں گذار کر مجھے اپنے سفلی خیال پر خود شرم آنے لگی۔ اور میں یہ محسوس کر کے کہ اب تک عوام کی طرح میں بھی انسان کی اخلاقی حالت کا بہت تاریک پہلو ذہن نشین کئے ہوئے مرد کو اصلی مردانگی غیرت شرافت اور عصمت جیسی اعلےٰ صفات سے عاری سمجھنے میں کس قدر فطری کمزوری کو نمایاں کر رہا تھا۔ بہت نادم ہوا۔ ان لوگوں میں اپنے پاک اور بلند جذبات پر اعتماد کلی انہیں انسانوں کی جبلی کم مائگی کی پیدا کردہ قیود سے آزاد کر چکا تھا۔ غالباً اسی اعتمادِ شخصی اور اعتبارِ مجلسی کا نتیجہ تھا۔ کہ ان لوگوں کو جذبات سفلی کا غلام بن کر سلامتیٔ عصمت کے واسطے خلاف قدرت آئینِ اخلاق وضع کر کے جنسِ لطیف کو محصورِ حرم سرا کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ ارتکاب گناہ وہاں بھی ہر جگہ کی طرح ہوتا ہوگا۔ لیکن ان کا ضمیر سدِ ارتکاب میں جرم آفرین پابندیاں لگا کر اخلاق انسانی کے معیار کو ضعیف نہیں ہونے دیتا تھا۔ غرضیکہ اس بستی میں حشرات الارض سے لیکر حورانِ ارضی تک اپنی قدرتی آزادی میں مسرور صحتِ اخلاق اور خوبیٔ پیکر میں مکمل نظر آتی تھیں۔ آزاد والدین کے بچے بھی اخلاق و اطوار میں بلند و عالی حوصلہ

ہونے ضروری تھے۔ کہ یہ منظر زرد رو منحنی مخلوق سے وہ خطۂ پاک بالکل آزاد تھا۔ اگر آپ نے کبھی بچپن کے زمانے میں خانہ زاد شیرازی ولقا کبوتروں کے درمیان جنگلی کبوتر کو پر کاٹ کر پالنے کی سعیِ لاحاصل کی ہے۔ تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھ خانہ بدوش سوارِ موجِ سیلِ زمانہ کی اس متمدن بستی میں کیا کیفیت تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے خانگی مردِ لقا کبوتر پاکیزہ سفید پروں کو پھیلائے ترنگ شباب میں گردن کو پیچھے ڈالے اپنی حور وش کبوتری کے اردگرد ناچتے پھرتے تھے اور تازہ اسیر نیلگوں پروں میں اپنی گذشتہ آزادی پر سوگوار جنگلی کبوتر ایک کونے میں دبکا ہُوا بیٹھا رہتا تھا۔ لقا کبوتر رقص کرتا ہُوا غٹرغوں کی تان لگاتا سفید براق کبوتری کے گرد گھوم کر بیجنوں کی تال بجاتا ہُوا جنگلی کبوتر کو دیکھتے ہی حسدِ بیجا کے سبب بیچارے آوارۂ آشیاں مسافر کو ٹھونگ مار جاتا تھا میں بھی اس نو گرفتارِ تہذیب کی طرح اس خوش بخت آبادی کے وارِ تغافل وجور استہزا سہتا تھا اور دل میں کڑھتا تھا۔

آخر یہ سمجھ کر کہ جب زندگی اسی جگہ بسر کرنی ہے۔ تو غربت کو وطن سمجھ کر دل بہلانیکی کوشش کرنی چاہیئے۔ میں نے ان لوگوں کے اصولِ معاشرت اخذ کرنے شروع کئے۔ میں عمداً اپنی حرکات وسکنات طرز بول وچال میں ان کی نقل کرتا اور سوچتا کہ میں اس طرح تبدیلِ عادات میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہوں۔ اب میں اپنے گرد وپیش کے حالات سے مانوس ہو چلا تھا۔ وہ لوگ بھی اب مجھے وحشی نہ سمجھتے تھے بعض لوگ میری تبدیل معاشرت سے دھوکہ کھا کر مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے۔ مجھے دل بہلانے کے لئے ایک بزم بھی میسر آ گئی تھی۔ اور ان لوگوں کی نقل

کرتے کرتے میں اس قدر ماہرِ فریب ہو گیا تھا۔ کہ مجھے اپنی پہلی زندگی سے خود بیزاری ہو گئی۔ اور میں اس مقام کو اپنا وطن سمجھنے لگا۔

ظاہری عادات ہزار بدل جائیں۔ لیکن فطرت کہاں بدل سکتی ہے۔ اگرچہ میں گپ کی بزم میں بیٹھ کر قتلِ اوقات کے لئے بہترین ہرزہ سرائی کر لیا کرتا تھا۔ لیکن ہر وقت میرے دل میں ایک مبہم سی ناقابلِ ضبط خواہش ہوا کرتی تھی۔ کہ کاش مجھے مرنے سے پہلے ایک ایسا رفیق میسر آئے جس کے سامنے میں اپنے راز بیان کر کے خلجانِ سکوت کو رفع کر سکوں۔ کوئی ایک شخص مجھ پر ایسا قابو پالے کہ میں خود غرضانہ زندگی سے متنفر ہو کر اپنے افکار سے بالکل بیگانہ ہو کر وجودِ غیر میں جذب ہو جاؤں۔ میری زندگی بالکل غیر ذمہ دار شخص کی طرح بے حس ہو چلی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ دوسرے شخص کا درد اپنے دل میں محسوس کروں۔ میرے خیالی دوست کی تکلیف مجھے پھر دل مبتلائے درد رکھے۔ میری آرزو تھی۔ کہ یگانگتِ اور ارتباط کے سرُور پیہم کے علاوہ عارضی اختلافات اور نمائشی پیکارِ الفت کی جراحت مجھے عرصہ تک بیقرار رکھے۔ آہ یہ تو انتہائے محبت کی کیفیات ہوا کرتی ہیں جسے کچھ ارباب محبت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے تو بادی النظر میں ایک مخلص ہمدرد کی ضرورت تھی۔ جس کی شفقت خصوصی مجھے آلام زمانہ سے رہائی دلانے میں مددگار ہو۔

مقامی کلب میں ہر روز شام سے کچھ پہلے ایک خاموش پیکر بلکہ کثافت جسدی سے بیگانہ انسانی روح کا لطیف مجسمہ فضائے باردہ میں شناوری کرتا ہوا شیخ بزم کو مسحور متانت کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس کے "عشرت منزل" میں قدم رکھتے ہی شیخ بزم اور اس کے حواریوں کی

زبانیں گپ کے ناقابل ہوکر سنجیدہ مسائل پر نکتہ ریز ہوجایا کرتی تھیں
ہم لوگ اس خاموش شاعر کے داخل بزم ہوتے ہی ہرزہ سرائی کو فوراً
ختم کرکے عالمانہ نکات کو زیر بحث لاکر عرصے تک فلسفۂ جذبات اور
معارف عالیہ پر طویل تقریریں کیا کرتے تھے ہماری کاہش دماغ سے
تراشے ہوئے خطابات سُنکر وہ کبھی تو مُسکرا دیتے تھے۔ اکثر ابروئے
چشم کی خفیف سی جنبش سے داد بھی دے جاتے تھے۔ بعض دفعہ سکوت
دائمی کو توڑ کر اپنی رائے بھی شامل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ بزم اپنی ہمہ دانی
کے زعم میں بعض دفعہ دقیق مسائل پر اُنہیں لکچر دینے لگتے تھے تو وہ
اپنی شعلہ ریز نگاہ مخاطب پر گاڑ کر شرارۂ استہزا گراتے تھے کہ شیخ بزم
کو جل بھن کر خاموش ہوجانا پڑتا تھا۔ میں ان محاربات دماغی کا مشاہدہ
کرتے کرتے گرم بازار عطار کی طرح علم النفس میں نیم حکیم کے درجہ
تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن میرا مبلغ علم نووارد کے مزاج کو سمجھنے کیواسطے
حریف فہم نہ تھا۔ ہر وقت میرے دماغ میں اس ملکوتی صفت انسان
سے تحصیل معرفت کا شوق اژدر رہتا تھا۔ آخر ایک روز کلب سے
رخصت کے وقت میں ان کے ساتھ ہولیا اور عرض کی۔ کہ "میں باوجود
جہاں گرد ہونے کے دُنیا فہمی میں آج تک اُمّی ہی رہا۔ آپ کے مقابل
میری آگہی بچّے کی واقفیت سے زیادہ نہیں۔ میرے مطاع محترم مجھے
اسرار حیات سے آگاہ کیجئے"۔

وہ میری التجائے عقیدت سُنکر مسکرائے غالباً وہ اب بھی میری
تقریر کو پُر تصنع سمجھ کر تبسم انکار فرما رہے تھے۔ مگر میں دامانِ فیض سے
جدا ہونے والا کب تھا۔ ہمیشہ کے لئے سائے کی طرح ان کے ساتھ

وابستہ ہو گیا کچھ عرصے کے بعد وہ بزم درہم برہم ہو گئی۔ اور شیخ بزم ہمیشہ کے لئے حلقۂ ارادت سے ہجرت کر گئے۔ لیکن میں ذوقِ عقیدت سے مجبور اس دانائے رموز کے دامن کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔

مجھے چند ہی روز ان کے ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ ظاہر اس وجود کے اندر آتشِ اخلاص فروزاں تھی۔ لیکن نمائش خواص سے وہ بیزار تھے اور دنیا کی خود غرضانہ روش نے انہیں دیوجانس کا ہم عقیدہ بنا دیا تھا سیاسیات میں حریت و مساوات کے وہ خطرناک حامی تھے۔ اور فطرتاً آزاد نسلِ آدم میں ظالم گروہوں کی مدارج سازی اور معاشرتِ دنیاوی میں تفریقِ مراتب انہیں بہت رنج دیتی تھی۔ چونکہ ان کے قریبی دوست بھی ان کے خیالات سمجھنے کے نااہل تھے۔ اسلئے وہ سکوت مستمرہ کے عادی ہو گئے تھے۔

بیسویں صدی میں جب کوئی شخص ان کے سامنے تعلقات محبت پر گفتگو کرتا تھا۔ تو وہ خلافِ وقت مبحث سنکر بہت بیزار ہوتے تھے۔ ایک دن بڑے جوش میں مجھ سے کہنے لگے کہ "آجکل کی سوسائیٹی میں بڑا نقص یہ واقع ہو گیا ہے کہ جذبات محبت کے مطیع ہو کر اہم ترین فرائض انسانی کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں میں تلاش کر کے دیکھ لو عاشقانہ ذکاوت قلبی کو بہت ترقی پذیر پاؤ گے۔ جس کا خطرناک نتیجہ ساری قوم پر اپنا مہلک اثر ڈال رہا ہے۔ یہ لوگ فن محبت دیگر فنون فاضلہ کی قربانی کر کے سیکھتے ہیں اس لئے بیکار حیات میں کٹ جاتے ہیں۔ اس بے لگام جذبہ نے قوم میں دوسرے درجے کے شاعر تو بیشمار پیدا کر دیئے ہیں۔ لیکن شاعری میں بھی صنفِ عاشقانہ

ہی کو ظاہری فروغ نصیب ہُوا ہے۔ قدرتی اخلاقی اور رزمیہ شاعری بالکل ناپید ہوگئی ہے۔ کیونکہ شاعروں کے جذبات تمام تر محبت کی موشگافی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دماغ اعلےٰ مسائل سوچنے کے قابل ہی نہیں بنتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زمین شاعری کی شادابی تغزل کے خس و خاشاک کے سوا کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔"

میں اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہمدردی کا محتاج بزم جہاں سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ مدت کا رُکا تھا۔ نوحۂ غم کے محتاج شنوائی کو اس سے بڑھ کر دردمند کہاں مل سکتا تھا۔ قصۂ درد جس سے اب تک کسی دوست کے کان آشنا نہ ہوئے تھے۔ انہیں سُنا کر دل ہلکا کر لیا کرتا تھا۔ وہ میری کمزور طبیعت پر ہمیشہ متاسف ہُوا کرتے تھے اور میری ہمت بڑھانے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ان کا پیکِ حیات ایک جادۂ مستقیم پر چل رہا تھا۔ ان کی ہر بات مجھے پاکیزہ معلوم ہوتی تھی اور میں انکی تقلید سے اکتساب فضائل کیا کرتا تھا۔ ان کا ہر فعل میرے لئے سنت عمل ہُوا کرتا تھا۔ میں انکے ساتھ انتہائے یگانگت کا خواہشمند ہوتا تھا لیکن وہ اپنے اخلاق میں مجھ سے بہت ارفع تھے اسلئے اتحاد قلبی سے یگانگت کا پیدا ہونا ناممکن تھا میں چاہتا تھا۔ کہ ان کے "تتبع سے عملاً و اخلاقاً بالکل ان کا مثنے بن جاؤں اگر دو مختلف شخصیتیں ایک دوسرے میں سما کر یکرنگ نہ ہوسکیں۔ تو میں اپنی فطرت معنویہ پر انکا رنگ اخلاق چڑھا کر ان کی وسیع ذات میں سما جاؤں۔ میں اس عمل جذب کو انتہائے عقیدت سمجھتا تھا۔ میں ان کے احسانوں سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ ان کے سحر التفات سے میری قلب ماہیت ہوگئی تھی۔ اور اب میں اپنے آپکو بالکل نیا آدمی پاتا تھا مجھے انکی توجہ اور شفقت نے ایک نئی زندگی

بخشی تھی مجھے زیادہ علم تو انکی پُر درد نصائح سے ہُوا تھا۔ لیکن میری زندگی میں تبدیلی کا کثیر حصّہ محض ان کی عادات کی کامل نقل کرنے سے پیدا ہو گیا میں مدّت سے اشرف انسان کی تلاش میں تھا۔ اور اب کہ مجھے ایسا انسان میسر آ گیا تھا میرے دل میں تجربات زندگی کا فقط ایک نتیجہ انتہائی صدائے الہام کی طرح گونجنے لگا۔ یعنی "محبوب کے ساتھ انتہائے محبّت یہی ہے کہ انسان ہر رنگ میں اپنے تئیں یار کا نقش ثانی بنا دے" زندگی میں کامیابی کا یہی ایک بڑا راز ہے کہ پہلے ایک سب سے بڑے انسان کی تلاش میں سرگرداں ہو اور پھر اس کے نقش قدم پر چل کر خود بھی ویسے ہی بننے کی کوشش کرو تو ایک دن تمہیں اپنے تبدیل شدہ وجود پر بجا فخر ہو گا۔ چاہو تو آزما دیکھو۔"

ایک دن میں نے ان سے ہجوم افکار سے رستگار ہونیکا طریق دریافت کیا اور اپنی ناکام زندگی کا علاج چاہا۔ تو فرمانے لگے "آسمان کی طرف دیکھنا اور ملاء اعلےٰ پر خیالات دوڑانے چھوڑ دو۔ ہر وقت نزدیک ترین فرض پر نگاہ رکھو اور اسی کی تکمیل میں ہمہ تن مستغرق رہ کر اپنے تئیں وقف کر دو سکون قلب یوں ہی میسر آسکتا ہے۔ لا تعداد افکار پر غور کرنے سے افکار میں ہمیشہ زیادتی ہوتی رہے گی لیکن سب سے پہلے فرض کو انجام دینے کی فکر دنیا و مافیہا سے مستغنی کر دے گی۔"

میں اب بھی ہمیشہ کی طرح تاریخی انقلاب میں گرفتار ہوں لیکن ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ اے رب ابراہیم و محمدؐ اگرچہ انقلاب روزگار نے مجھے میرے آخری حبیب سے جدا کر دیا ہے لیکن اس کے دفتر نصائح کو چراغ راہ بنائے رکھنے کی توفیق عطا فرما اور اسکی پاک زندگی کو [illegible] مشعل ہدایت [illegible] انقلابوں سے [illegible] آمین۔

انحطاط

میرا بی۔اے میں آخری سال تھا۔طالبعلمی کی ضمنی دلچسپیوں میں ایسا محو ہو چکا تھا۔کہ اس زندگی کی انتہا فقط موت ہی پر سمجھا کرتا تھا۔جب سے ہوش سنبھالا مکتب کی درسی مشقت میں عمر گذاری کچھ دھیرے دھیرے چلنے کا عادی ہو گیا۔اس لئے دیگر ہم جماعتوں کی تیز روی پر حیران ہوا کرتا تھا۔مگر خود اُسی چال سے چل رہا تھا۔کالج کی زندگی سے ایسا مانوس ہو گیا تھا کہ بی۔اے کے امتحان کی تیاری کے وقت بعض دفعہ اپنے دل میں کہا کرتا تھا "یا اللہ کہیں پاس ہی نہ ہو جاؤں" آخر وہی حادثہ پیش آیا۔جس کا دھڑکا لگا تھا۔مژدۂ کامیابی نے مجھ پر اُلٹا اثر کیا۔اب تک میں والدین پر احسان کرتا تھا۔کیونکہ اُنکی آرزوئے تعلیم کو کاہش دماغ سے پورا کر رہا تھا۔فراغت تحصیل کے بعد مجھے ان کے احسان کا احساس ہوا تلاش معاش کی عبث سعی کے بعد ان سے چند سالہ مشقت درسی کے صلہ میں پنشن کا خواستگار ہوا۔مگر تھوڑے ہی عرصے میں فراغِ مطلق سے گھبرا کر ایم۔اے کی تعلیم کا ڈھکوسلا کھڑا کر کے پھر کالج میں جا داخل ہوا ؛

بی۔اے کرنے سے کچھ پہلے میرے حواس پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔کیونکہ میری زندگی میں ناگوار تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔میری نشو حیات اس وقت تک فتنہ و فساد سے ہوئی تھی۔سنجیدہ و متین آدمیوں کو چھیڑ کر میں خوش ہوا کرتا تھا۔اگرچہ دروغِ محض کو گناہ سمجھتا تھا لیکن

تفنن طبع کے لئے حقیقت پر مبالغے کو ہمیشہ مستزاد کرتے رہنا بالیدگیٔ
خیال کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔" مزدوری پیشہ" اہل اللہ کا میں دشمن
تھا۔ روزمرہ کے گذارے کے لائق عبادت کو درستی اخلاق کے لئے
کافی سمجھتا تھا۔ لیکن پیہم ورزش تقوے بھی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔
ضرورت سے زیادہ شریف آدمیوں سے مجھے نفرت تھی کیونکہ جن لوگوں
میں مبداء فیاض سے شرارت کا مادہ ہی ودیعت نہیں ہوا انہیں سلیقۂ
شرارت کب آسکتا ہے۔ ایسے لوگ چونکہ اختراعِ شر کے قطعی نا اہل ہوتے
ہیں۔ اس لئے عوام کا حسنِ ظن انہیں نیک مشہور کر دیتا ہے۔ کالج
میں نووارد شریف طلباء مجھے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ میں بھی انکی یکساں
خاموش زندگی پر جس میں قہقہہ یا شیون کا نام تک نہ ہوتا تھا۔ رحم
کھایا کرتا تھا۔ میں ذراسی خوشی کے موقعہ پر تمام بورڈنگ کے مستہزی
لڑکوں کو اکٹھا کر کے بزم نشاط آراستہ کیا کرتا تھا۔ جس میں شاعرانہ عشرت
کے تمام لوازمات بحسن ترتیب مہیا کئے جاتے تھے۔ چونکہ سنجیدہ مزاج
طلباء کو ایسی مجالس سے نفور رہا کرتا تھا۔ اسلئے ہماری بزم نوحہ زندگی
سے محفوظ رہتی تھی۔ لیکن رنج کے موقعہ پر صبر کی تلقین کا میں سخت
مخالف تھا اور علی الرغم واعظین سانحۂ جانگداز پر خوب ہائے ہو مچایا
کرتا تھا۔ میرے جذباتی کیفیات میں میرا حریف بلاغت اللہ ہر حال
میں مجھ سے بڑھ کر تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں حسرت کا یہ شعر سنایا۔

ستم کرتے نہ تھا طالب میں تم سے مہربانی کا
مگر اس بے رخی نے لطف کھویا زندگانی کا

شعر سنکر وہ اتنے جوش میں آئے کہ کرسی سے اٹھکر کمرے میں ٹہلنے

لگے۔ دم بدم قدم تیز پڑتے تھے۔ چہرے سے جنون کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ میں نے کہا ہوش کرو۔ اور پکڑ کر بٹھا دیا۔ کہنے لگے۔ بس آج سے تم بوڑھے ہو گئے۔ مجھے بھی کچھ شبہ سا ہوا۔ کیونکہ اس سے پیشتر بارہا ہم اکٹھے ناچ کو دکر عمدہ شعروں کی داد دیا کرتے تھے۔ ہم کبھی کبھی شام کو قرآن مجید کا درس سننے کے لئے مغرب کے وقت اہل اللہ کے زمرے میں بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں بلاغت کے ساتھ عشا کے وقت مینہ برستے میں مکان پر واپس آیا۔ تو مجھے ایک دیرینہ حبیب کا رقعہ ملا لکھا تھا۔ کہ "میں ہر روز اسی وقت شاہدرے سے چلکر یہاں پہنچتا ہوں۔ لیکن ہمیشہ مایوس واپس جاتا ہوں" میں نے بلاغت سے کہا چلو تو ذرا ان کے مکان پر ہو آئیں۔ مجھے خیال تھا بلاغت انکار کر دینگے اور ناوقت کی زحمت سے میں بچ جاؤنگا۔ لیکن بلاغت فوراً تیار ہو گئے۔ اب میں نے سوچکر کہا "چلو صبح چلینگے۔ اسوقت اُنہیں کیا بے آرام کرنا ہے" بلاغت کہنے لگے " واقعی تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ ہر ایسی خواہش کے پیدا ہونے کے بعد جو مزیل شان نہ ہو۔ انکا حصول بڑھاپے کی نشانی ہے"

مجھے معلوم ہوا کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور یہ بڑھاپا آج سے تین سال پیشتر سے میرے دل و دماغ پر پیہم وار کر رہا ہے۔ یہ میرے جذباتی بڑھاپے کی نشانی ہے۔ کہ میں گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوں۔ اور نئے دوست پیدا کرنے کا سلیقہ اپنے میں نہیں پاتا ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ ہر نئے طالبعلم سے ملکر اسکے مزاج کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا یا تو اسے شرف دوستی بخشتا تھا یا حریف صحبت نہ سمجھ کر اسکے

ساتھ کھلے بندوں دشمنی کا اعلان کر دیا کرتا تھا۔ اب میری زندگی میں
سوائے نوحۂ عشرت کے اور کچھ نہ رہا۔ میری آرزوئیں ہمیشہ میرے دوستوں
کے لئے باعثِ تکلیف ہوا کرتی تھیں۔ میں خواہشات پیدا کرتا تھا اور
دوستوں سے متوقع ہوا کرتا تھا کہ وہ میری تمناؤں کا احترام کریں۔ کسی
دوست سے خفیف سی اشارت انکار پا کر میں آگ بگولا ہو جایا کرتا تھا
کیونکہ "نہیں" سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ بی۔ اے کے بعد کالج سے
نکلکر میں تشنۂ آب مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ آخر ایم۔ اے کی آرزو کا اعلان
کر کے اسی جان بخش درس گاہ میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ میرے خیالات کو
سمجھنے والے میرے جذبات کو تبسم الفت سے پرورش کرنے والے ان
سب سے بڑھ کر مجھ میں شوق انتقام کو زندہ رکھنے والے یعنی میرے
حریف وہیں موجود تھے۔

اب کبھی کوئی آرزو بھی ہوتی ہے تو کسی دوست پر ظاہر نہیں ہو سکتی
کیونکہ دفتری زندگی نے مجھے خاموش جہاد کا عادی کر دیا ہے۔ میرا دل ماضی
کی آرزؤں کا مرقد ہے اور میرا نفس ناطقہ اسکا سوگوار مجاور شائد میرے
دوست خوش ہوں۔ کہ میرے مطالبات کا بوجھ انکے سر سے ہمیشہ کے
لئے اتر گیا ہے اور وہ محاربات الفت سے قطعی امن میں ہو گئے ہیں
لیکن انہیں کیا معلوم کہ پیکارِ محبت ہی کا نام زندگی ہے۔ دوستوں کے
درمیان سلسلۂ اصرار و انکار انہیں جوان رکھتا ہے۔ دائمی صلح و اتفاق انحطاط
جذبات کی دلیل ہے اور قطعی انحطاط کا نام موت ہے۔ ؎

حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز
باقی ہیں شوقِ یار کی ابتک نشانیاں

سکونِ یاس

سرا پا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

قربِ اتفاقی کے زمانے میں ہر ملاقات پر میرے دل میں اُمنگیں ہوا کرتی تھیں میں اپنے جذبات پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی خواہشات دبانے کی کوشش میں کمزور ثابت ہُوا کرتا تھا۔ جس کا خطرناک نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ میں مجبورِ تمنا ہو کر جو بات دل میں اُٹھتی تھی۔ فوراً درخواست کے پیرایہ میں ظاہر کر دیا کرتا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے میری اس ہوسناک التجا کا جواب امید سوز "نہیں" سے دیا جاتا تھا۔ میری اس وقت کی حالت کا اندازہ کوئی شخص بلا اپنی ذات پر وہ کیفیت وارد کئے نہیں لگا سکتا۔ مجھے قدرت نے بہت نازک احساس پیدا کیا ہے۔ ایسی درشت "نہیں" سے تحصیلِ عشرت کا خیال تو یکسر مٹ جاتا تھا۔ اب اس کی بجائے احساسِ زبوں بختی اور خیالِ تحقیر مجھے بلائے جان ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنی خود فروشانہ زندگی کا تصور مبتلائے رنج کر دیتا تھا اور اب میں متاعِ عقل کو سنبھالے اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ "کیوں وارفتۂ خیال ہو کر اپنے سامانِ انبساط کو ایک اپنے ہی نوع کے انسان کے ردّ و قبول کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے"

جو مایوسی کہ الٰہی نظام کے ماتحت ہو۔ اس پر صبر آجاتا ہے۔ لیکن جو بے آبروئی کہ اپنے ہمجنس کی جانب سے انکارِ التفات سے پیدا

ہو میرے لئے الم انگیز کلفتِ قلبی کا باعث ہوتی تھی۔ ہمیشہ اس نفئ مروت کے سنتے ہی میرا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ پیشانی پر عرقِ خجالت آجاتا تھا دل کی حرکت بے قاعدہ ہو جاتی تھی۔ میں غم و غصّہ کے باعث چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں۔ ایسی کیفیت کرب میں میں احتیاجِ مجلس سے شرمندۂ منت ہو کر دل سے اقرار کرتا تھا کہ آئندہ ردِ سوال کی تحقیر سے اپنی بے آبروئی کبھی نہ کراؤنگا۔ لیکن تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد پھر وہی آرزوئے سوال اور جوابِ نفی کے ساتھ احساس ہتک مجھے لرزۂ اندوہ میں مبتلا کر دیتا تھا آہ ستمِ انکار کی بھی انتہا نہ تھی۔ اگر کسی اہم درخواست پر انکار ہوا کرتا تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ کیونکہ میں یہ سمجھ کر صبر کر لیتا۔ کہ جوبات ان کے بس کی نہیں وہ اُن سے منوانی بیجا اصرار ہے مگر وہاں تو ایسی معمولی بات پر جس کے ماننے میں ان کا قطعی کوئی ہرج نہ تھا اور مجھے ذہنی خوشی میسر ہوتی تھی۔ ان کی جانب سے انکارِ مطلق کلیجہ شق کر دیتا تھا۔ دعوت شیراز سے لے کر ہدیۂ پان تک پر یکساں انکار ہوا کرتا تھا۔ اور جب میرے بیحد اصرار پر مجبور ہو کر کبھی مان بھی لیتے تھے۔ تو تکرار و اصرار کی شدت کے باعث حصولِ مدعا کی نشاط کا اثر میرے دل سے بالکل زائل ہو جاتا تھا اسے استہزائے تقدیر کہو یا جبلی ستم ظریفی سمجھو۔ وہی معمولی سی بات جو ایک عام شناسا کی خواہش پر وہ بکمالِ خندہ پیشانی منظور فرما لینا شرطِ اخلاق سمجھتے تھے۔ میری مسلسل التجا پر دلشکن "نہیں" کے ساتھ رد کر دیا کرتے تھے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ فلسفۂ اظہارِ آرزو و اصرارِ درخواست سے واقف نہ تھے کیونکہ مجھے اپنی تمام زندگی میں ان سے بڑھ کر جذبات

فہم انسان میسر نہیں آیا۔ غالباً وہ میری بے اعتدالیوں کو روک کر مجھے متانت کی روش پر لانا چاہتے تھے۔ آہ انہیں یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ معمولی سی درخواست اور پھر اس پر اصرارِ مزید اربابِ وفا کے درمیان ازدیادِ محبت کا باعث ہوتی ہے اگر تعلقاتِ الفت میں ہجومِ تمنا اور خواہشِ حصولِ آرزو نہ ہو تو حدتِ شغف میں انجمادی سکون واقع ہوجاتا ہے۔

اب میں نے عاجز آ کر بے آبروئی کے خوف اور اندیشۂ ناقبولی کی وجہ سے تمام ادنےٰ و اعلےٰ درخواست کرنی یک قلم بند کردی ہے کیونکہ میرے ذکی الحس دل میں تہتکِ انکار کے برداشت کی تاب نہیں۔ جس کا لابدی نتیجہ ہے کہ ہماری آشنائی میں وہ حدت وہ شعلہ آشامی باقی نہیں رہی نہ میری جانب سے ※"جنگ آموز" نہیں" نہ جانبین میں ہنگامہ پیکارِ الفت۔ ان کی سردیٔ مزاج نے میرے غرورِ محبت کا خون کردیا ہے۔ میرا اضطرارِ قلب ان کے پیچ بستہ تغافل کی قربان گاہ پر صدقۂ اطاعت ہوگیا ہے۔ اب فقط ایک سکوتِ یاس ہے جس نے ارمان سوزِ موت کی طرح مجھے قبر کی خاموشی سے مانوس کر دیا ہے۔ غالباً وہ اس بے صدائے مدعا، حسرت آفرین، نیازمندی کو میرے سابقہ ہیجانِ محبت پر ترجیح دیتے ہیں ؎

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

خفائیؔ

※ روزمرہ کی ذرا ذرا سی رمزِ محبت پر اصرار نہ اُن کی جانب سے

دلدادۂ یاس کے نام

اے میرے "یخ بستہ تغافل کی قربانگاہ پر صدقۂ اطاعت" ہوجانے والے اپنی قبر کی خاموشی کے گہرے خواب سے بیدار ہو۔
اے میرے "مسلسل التجائیں" کرنے والے میں تمہارے علم فلسفہ کی گتھیوں کے سلجھانے سے عاری ہوں۔ لیکن جسے تم "فلسفۂ اظہارِ آرزو واصرارِ درخواست" کا خوفناک نام دیتے ہو۔ اس سے میرا اُلفت آشنا دل بھی ضرور آگاہ ہے!
مجھے کتنا افسوس ہے۔ کہ تم "ازدیادِ محبت" کے آرزومند ہو کر "قرب اتفاقی" ہی کے زمانہ میں "حدتِ شعف" کو اپنا مطمحِ نظر سمجھ بیٹھے۔ میری "نہیں" "درشت" سہی "امید سوز" سہی "دلشکن" سہی! تمہاری امیدوں کے بہلانے تمہارے دل کے توڑ ڈالنے میں مانا کہ میں نے ذرا سی کوتاہی بھی نہیں کی لیکن تم جو "ہجومِ تمنا" کے تماشائی اور "خواہشِ حصولِ آرزو" کے تمنائی تھے اب ذرا خدا لگتی کہنا کہ ان "معمولی" باتوں سے جن کے ماننے میں میرا کوئی ہرج نہ تھا تم ایسے مشکل پسند کو کیونکر "ذہنی خوشی" نصیب ہوسکتی تھی!؟!
آپ "نازک احساس" ہوں آپ کا دل "ذکی الحس" سہی مگر آپ حقیقت پسند ہو کر "ذہنی خوشی" کو "معمولی باتوں" سے کیونکہ وابستہ کرلیتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ تم خود اپنی اصلیت سے واقف نہیں۔ تم خود اپنے دل کی گہرائیوں سے آگاہ نہیں ہو اور وہ میرا ہی دل ہے کہ جس نے اس

کے قعرِ عمیق تریں میں غوطہ زن ہو کر اُس کے موتیوں کی نرم و نازک ضیاء کو دیکھ پایا ہے؛

تمہاری "حدتِ شغف" تمہاری زندگی کی سطحِ ساکن پر روز و شب نئے نئے طوفان بپا کرتی ہے۔ اور تمہارا بیقرار سمندر دُنیا کے ساحلوں پر اپنے مدوجزر کی شان دکھاتا رہتا ہے۔ تم اسی کو "اظہارِ آرزو" تم اسی کو انتہائے جستجو سمجھے ہوئے ہو لیکن یقین جانو کہ تمہارا ابحرنا پیدا کنار اپنے اندر ایسی اچھوتی کیفیتیں پنہاں کئے ہوئے ہے جن سے تم خود بے بہرہ ہو اور وہ میرا ہی دل ہے جس نے حقیقتِ محبت کی تلاش میں اُسکے نامعلوم غاروں کی تہ کو پالیا ہے!

"انکارِ التفات" کو "بے آبروئی" پر محمول کرنا اور میرے "ردِ سوال" کی "تحقیر" سے غم و غصہ اور "کرب و عنا" کا شکار ہو جانا یہ وارفتگیِ عقل و خیال نہیں تو اور کیا ہے؟

آہ "تحصیلِ عشرت" کی "خود فروشانہ زندگی" کے آگے "مجبورِ تمنا" ہو کر مبتلائے رنج ہو جانا ہی "استہزائے تقدیر" یہی "جبلی ستم ظریفی" ہے۔ وہ "احساسِ ہتک" جس سے گرفتارِ محبت "لرزۂ اندوہ" میں مبتلا ہو جائے وہ "اضطرارِ قلب" جو اُسے "تکرار و اصرار" پر مجبور کر دے استقلالِ اُلفت کا خون کئے بغیر نہیں رہتا۔ سچی محبت نہ محض صبر و جبر سے آشنا ہوتی ہے۔ بلکہ وہ متانت کی روش پر چلنا اپنا پہلا فرض سمجھتی ہے! سچی محبت اصولِ موضوعہ کو اپنا شعار بنانا عین راحت تصور کرتی ہے!

تم میری "نہیں" کو "جنگ آموز" کہتے ہو۔ لیکن اتنا نہیں جانتے کہ وہ "ہاں" جو بظاہر "صلحِ کل" نظر آتی ہو۔ بالآخر بے انتہا ناچاقیوں اور

غلط فہمیوں کا مظہر بنکر افق محبّت پر اپنی منحوس صورت دکھاتی ہے! سچ پوچھو تو یہ "نہیں" عموماً صلح آموز اور یہ ہاں اکثر فتنہ انگیز ثابت ہوتی ہے۔ ہماری دُنیا اسی نہیں اور ہاں کا اکھاڑا ہے!

مشرق کی حقیقت پسند محفلیں نہیں کی تُرشی سے مستفید ہوتی ہیں اور مغرب کی پامالِ عشرت انجمنیں ہاں کی چاشنی سے حظ اُٹھاتی ہیں۔ مجھے کتنی خوشی ہو اگر تم مغربی علوم وفنون سے فیضیاب ہوکر مشرقی اصولوں پر کاربند رہنا سیکھ لو کہ ہم ہندیوں کے لئے اسی میں ترقی وتہذیب کا راز مضمر ہے نہ عیش کی جستجو میں مغرب کی سی "شعلہ آشامی" ہو اور نہ روحانی "افسردہ خیالیوں" میں مشرق کا سا "انجمادی سکون"!

اور اسی طرح محبت میں بھی جو قلبِ انسان کا بہترین جذبہ ہے نہ قیامت کا شور ہو "نہ قبر کی خاموشی" نہ تو "معمولی" سی بات کے منوانے کی بیکل تمنّا اور نہ اسرارِ نہاں کے بتانے میں ایک "بے صدا بے مدعا حسرت آفریں نیازمندی"!!!

شہنائی
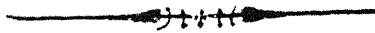
زندۂ جاوید

نے مژدۂ وصال نے نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا۔ آج سے تین سال پہلے اُنہیں اول بار ایک ادبی مجلس میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن وہ ملاقات کیسی رواروی کی تھی۔ اس بزم میں میرے نصف درجن شناسا موجود تھے جن میں سے ایک شاعر اور دوسرا شاعرگر بھی تھا۔ نوعمر شاعر اپنا کنوارا کلام کسی اور شخص کے نام دھر کر سُنا رہا تھا غالباً کم سن شاعر نقادانِ فن کی بے جگری سے ہراساں اپنے تئیں پسِ پردہ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرا شاعرگر اپنے مخصوص شاعر "صف شکن" کے اشعار حریفانہ انداز میں بھمہ پیکر حول اچھل اچھل کر گلے کی رگیں پھلا کر بلند آہنگی کے ساتھ گا کر سُنا رہا تھا۔ سب اربابِ فہم مزا لے رہے تھے فقط وہ مُہر بلب ایک ہلکی سی کُرسی پر ساکت بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دو گھنٹے کی صبر شکن صحبت میں حریف سخن پروازوں کے فقط تین یا چار چوٹی کے اشعار ان سے خراجِ تبسم حاصل کر سکے۔ میری مردم شناس طبیعت نے مجھے بہت دھوکا دیا۔ کیونکہ میں اس خاموشی کو "سکوتِ دور اندیشی" یعنی سکون جہالت سمجھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اِس خاموشی میں بھی حاضرین کے عامیانہ مذاقِ سخن پر ایک باریک

سی نوائے استہزا مضمر ہے۔ جس کی آواز سے شورش آشنا کان لذت گیر نہیں ہو سکتے۔ اُس وقت وُہ ایک تنہا لالۂ صحرائی کی طرح اپنی جگہ پر بےحس و حرکت سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کوئی نکہتِ جان آفرین اس جگر سوختہ داغدار پھول سے پیدا نہ ہوتی تھی جو اس کی زیست کا یقین دلا سکے گرد و پیش صد زبان خوشبودار گلابوں کی ناقابلِ برداشت تیز لپٹوں سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

حقیقت میں یہ میری بڑی ہی بد قسمتی ہوتی۔ اگر اس اتفاقی ملاقات کے بعد پھر مجھے اُن سے باقاعدہ تعارف نہ ہوتا کیونکہ دوسری ہی ملاقات نے میرے اُس شب کے خیالات کو ان کی طرف سے بالکل بدل دیا اب وُہ مجھ سے باقاعدہ متعارف ہو چکے تھے۔ ایک دن بازدید کے لئے مَیں ان کے کاشانۂ نعمت پر پہنچی۔ تو اُنہیں پیشتر کی طرح خاموش پانے کے بجائے ایک پُرانے نحیف و زار دوست کو فلسفۂ حیات پر لیکچر دیتے سُنا۔ ان کے لب و لہجہ سے متانت اور اعتماد ٹپکتا تھا۔ لیکن کمالِ جوش کے باوجود ان کی آواز اب بھی مدھم اور صاف تھی وہ اپنی گذشتہ افسردہ خیالی (pessimism) کا اقرار کرتے ہوئے بتدریج اس کمزوری سے رستگار ہونے کا ذکر کر رہے تھے۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے اُنہوں نے کرسی سے ایک انچ اُٹھکر بڑے دلفریب انداز میں یہ شعر پڑھا اور پھر بالکل خاموش ہو گئے ؎

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے تو کیا
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

اب وُہ مجھ سے واقف ہو چکے تھے اور تقریباً ہر روز چند منٹ

کی ملاقات ہوجاتی تھی۔ کیونکہ لیڈیز کالج میں ایم۔ اے کلاس نہ ہونے کے باعث مجھے مجبوراً اُن کا ہم جماعت ہونا پڑا تھا۔ یہ زندگی میں مردانہ معاشرت کے مطالعہ کا مجھے پہلا موقعہ تھا۔ چالیس مردوں کی جماعت میں فقط میں ایک ناجنس شوقِ علم کی وجہ سے آپھنسی تھی۔ مجھے اب دیگر طلباء میں فقط وہ نمایاں اخلاق (Character) رکھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت وہ نسائی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے غیر معمولی احترام سے پیش آتے تھے۔ اُن کی پُر مغز مختصر گوئی سنجیدہ مزاجی اور پاکیزہ کلامی میری نگاہ میں ان کے تمام ہم جماعتوں پر باعثِ تفوق ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ اب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے ہیں۔ لیکن اُن کی ایک ایک ملاقات صحتِ مذاق کے لحاظ سے ایک دفترِ اخلاق ہے۔ جب تک زندہ ہوں۔ اُن کی تمام ملاقاتوں کو ذہن میں دُہرایا کروں گی اور اس سہ سالہ حیات کے زرّیں اوراق کو اپنے دل میں شیرازہ بند کر کے اپنے اعماقِ روح میں محفوظ رکھوں گی۔ تنہا گوشوں میں نصف شب کی تاریکی میں جبکہ تمام عالم پر مرگ آور خاموشی چھا جاتی ہے اور سُنتی ہوں کہ مرے ہوؤں کی روحیں فضائے علوی سے اُتر کر اپنی ارضی زندگی کی آماجگاہوں کی سیر کیا کرتی ہیں میں بھی اس ہولناک سناٹے کے عالم میں ان کی رُوح سے منت کش سماعت ہو کر اس سوانحۂ محبت۔ اس فسانۂ جاذبیت اس حکایۂ وفا۔ اس صحیفۂ قدس۔ کی تلاوت کیا کروں گی ؎

ان کی زندگی تحصیلِ علم کے لئے وقف تھی۔ میں نے اپنی سہ سالہ آشنائی میں نے ان کے منہ سے کوئی بات ایسی نہیں سُنی جس کا مخرج

علم ادب سے نہ ہوان کے مباحثے بھی ادبی ہوا کرتے تھے۔ حسن و عشق
کے عامیانہ جذبات ان کے مزکی وجود پر بالکل اثر نہ کرتے تھے۔
لیکن ٹیگور و اقبال کا کلام پڑھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے فیلسوف
عاشق بن جایا کرتے تھے مگر وہ اپنی فکرِ رسا سے اَن دیکھے مطلوب
تراشا کرتے تھے اور پھر ایک لمحہ بھر کے لئے تمام جذباتِ عاشقانہ
کے ساتھ اپنے فکر ساز کرشمۂ حُسن میں محو ہو جاتے تھے۔ مرد کی محبت
کو عورت کے لئے حُسن افروز سمجھتے تھے۔ کہتے تھے۔ کہ جس قدر خاوند
کو بیوی کے ساتھ زیادہ اُلفت ہوگی۔ اُسی قدر بیوی میں نشوِ حُسن ہوگا۔
عورت کے لئے تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبت کو قرار دیتے تھے۔
ان کا یقین تھا کہ اگر مرد میں حرارتِ عشق نہ ہو۔ تو عورت میں فروغِ حُسن
نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی کانِ ملاحت پری چہرہ
لڑکیاں بیدرد خاوندوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے شادی کے بعد چند
سال کے اندر کُڑھ کُڑھ کر عجوزہ بن جاتی ہیں۔ جس بدنصیب عورت
کو مردانہ تغافل کا عارضہ لاحق ہو جائے۔ وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔
ان کی رگ و پے میں سیماب بھرا ہُوا تھا وہ مشکل سے تھوڑی دیر
کے لئے ایک جگہ ساکن بیٹھ سکتے تھے اور مطالعۂ درسی کے علاوہ
وہ ہمیشہ ٹہل کر اوقاتِ معینہ گذارا کرتے تھے۔ مجھ سے مل کر وہ
کمرے میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ کُھلے میدانوں میں مجھے ہمراہ
لیکر سیر کو نکل جاتے تھے۔ چلتے چلتے کسی صحرا نشین کا راگ۔ رنگین تیتری
کا کسی پھول کے گرد طواف۔ برف آگین سرد ہوا کے جھونکوں سے شیشم
کے پتوں میں نوحۂ پرسوز کی آواز۔ یا مچلتی ہوئی دریائی لہروں پر چاند

کے عکس کی تھرتھراہٹ انکی صبارفتاری کو تھوڑی دیر کے لئے قطع کر دیا کرتی تھی۔ اور اب **وہ** حُسنِ قدرت پر لیکچر شروع کر دیتے تھے۔
وہ مجھ سے تنہائی کے عالم میں بے شمار باتیں کرجاتے تھے اور میں حیران ہؤا کرتی تھی۔ کہ دنیا کو اس ظاہرا خاموش شاعر کی نسبت کس قدر دھوکا ہؤا ہے۔ **وہ** تمام عالم کے لئے گونگے تھے۔ لیکن ان کے جوہر بلاغت فقط مجھ ہی پر عیاں ہؤا کرتے تھے۔ کیونکہ باقی دنیا کو **وہ** اپنے خیالات کے سمجھنے کا اہل نہیں خیال کرتے تھے ؛

اگرچہ بظاہر وہ بہت پُرسکون زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر ان کے دل میں قومی جوش تحت الارض موادِ آتشیں کی طرح سُلگتا (موجزن) رہتا تھا۔ جو کہ قدرتی تاثرات کے ماتحت کبھی کبھی مشتعل ہو کر انکے اندامِ خاموش میں زلزلہ برپا کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں ننھے **اختر آذری** کی سالگرہ پر مدعو کیا۔ فراغتِ رسم کے بعد **وہ** مع اپنے ایک مسلمان دوست **سرمدی** کے مجھ سے باتیں کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ **سرمدی** کی باتوں میں یوں تو ہمیشہ ہی سحرِ جاذبیت ہؤا کرتا ہے لیکن اس روز اس کی گفتگو ان کے دل پر غیر معمولی اثر کر رہی تھی۔ اس نے بلقان جانے والے ہندی طبی وفد کی بہت تعریف کی۔ میری نگاہ ان کے چہرہ پر تھی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ طبی وفد کے متعلق ایک ایک فقرے کے ساتھ ان کا رنگ سفید سے سُرخ اور پھر زرد پڑتا جاتا تھا اسی اثنا میں **سرمدی** نے ان سے پوچھا "طبی وفد کی اہمیت کار کے متعلق آپکا کیا خیال ہے" آہ نہ معلوم اس جملے میں کون سی بجلیاں بھری تھیں۔ کہ فوراً ان کے خرمنِ صبر و قرار کو شعلہ بن کر پھونک ڈالا اور **وہ**

چیخ مار کر میری گودی میں گر پڑے۔ اب وہ قوی دل انسان بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ ان کی قلب کی حرکت محسوس کرنے کے لئے ان کے دھڑکتے ہوئے سینہ پر رکھا تھا۔ جس کے اندر سے عام طور پر پُرسکون دل سدِ استخوانی کو توڑ کر اچھل اچھل کر باہر آنا چاہتا تھا۔ اُف اُن کا دل ایسی تیز رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ کہ گویا ابھی بند ہو جائیگا۔ اُس دھڑکن نے میرے ہاتھ میں ایک مستقل حسِ حرکت منتقل کر دی ہے۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی میری بائیں ہتھیلی میں سوئیاں سی چُبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُس حرکتِ لرزہ کا نقشہ میری کفِ دست پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں یہ سب حالتِ مذبوحی ان پر فقط اپنے احساسِ کمزوری سے وارد ہوئی تھی۔ اُس روز سے اُس ذکی الحس انسان کی عظمت میرے دل پر نقش ہو گئی اور اب معمولی شناسائی گہری دوستی میں تبدیل ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

کتابوں کے تو وہ کیڑے تھے۔ اس چھوٹی سی عمر میں اُنہوں نے ایک قطارِ شتر کا انبارِ کتب اپنے گھر میں جمع کر لیا تھا۔ کالج بند ہونے پر مجھے اپنے بھائی فرامرز آذری کے پاس احمد آباد جانا تھا۔ میں رخصت ہوتے ان کے مکان پر گئی۔ آتے ہوئے ان کی دی ہوئی فلسفہ زندیق کی چند کتابیں ہمراہ لیتی آئی۔ ان کتابوں کو خود پڑھا اور اس خیال سے کہ ان کی دی ہوئی ہیں فخریہ اپنی سہیلیوں میں مطالعہ کے لئے تقسیم کر دیا۔ جب تین ماہ کے بعد اُن سے پھر ملی۔ تو وہ تمام کتابیں انہیں واپس کر دیں۔ میری ایک سہیلی سے ایک کتاب

"عذر متشلک" ضائع ہوگئی تھی۔ جس کے بجائے اُس نے نئی کتاب خرید کر مجھے باقی کتابوں کے ساتھ واپس کردی تھی۔ مجھے علم تھا۔ کہ گم شدہ کتاب کے بجائے نئی کتاب بہم پہنچائی گئی ہے۔ لیکن مجھ سے چونکہ ایسی بے احتیاطی ہونی دشوار تھی۔ اس لئے میرا ضمیر مطمئن تھا۔ اب اسے دروغ مصلحت سمجھو یا مغلوف راستی کہو۔ جب اُنہوں نے مجھے شکایتاً کہا۔ کہ کتاب اگر گم گئی تھی۔ تو نئی حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تو میں فوراً مُکر گئی۔ کیونکہ کتاب مجھ سے ضائع نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک قسم کا جھوٹ تھا۔ جو مجھے ان سے بولنا پڑا۔ آہ اگر وہ اَور زندہ رہتے تو میں ضرور اُن سے اقرارِ گناہ کرتی۔ اس ایک بدنما واقع سے قطع نظر میں اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے آج تک ان سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی کسی بات کا اخفا نہیں کیا۔ بلکہ میں تو ہر ملاقات پر اپنے تمام راز اُنہیں بتا کر اُنکی شرکتِ درد سے خوشی حاصل کیا کرتی تھی۔ آہ دنیا میں کتنے آدمی میری طرح فخر کر سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے دوست سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی اور کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

ہندوستان کے تمدن کے اثر سے عورت مرد کی دوستی اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور جو ہو بھی تو مذموم سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے۔ کہ قدرتی جذبات سے مجبور ہو کر خوش اخلاق مرد عورت کی شناسائی کا انجام عقدِ نکاح ہوا کرتا ہے۔ جو اربابِ وفا کے درمیان سوائے موت کے جاں گسل وار کے ٹوٹ نہیں سکتا۔ غالباً اس حدبندی نے ہندوستان کے عورت مرد کے تعلقات کو ابھی تک استوار نہیں

ہونے دیا۔ کیونکہ جس دوستی کا انجام پیوندِ شرعی ہو۔ وہ زندگی میں ایک بار اور فقط ایک ہی سے قائم ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ خون آشام کھیل چار مرتبہ بھی کھیلا جا سکتا ہے اور ایک مرد ایک وقت میں چار عورتوں پر اصولِ مساحت کے ماتحت مساوی الحجم حصوں میں تحفۂ اخلاص تقسیم کر سکتا ہے۔ حالانکہ نفسیات کے ماہر تو یہی کہتے ہیں۔ کہ "محبت ایک سے نبھتی ہے۔ دو دو سے نہیں نبھتی"۔ مگر وہ ستونِ قدس تو دوستی کے معاملے میں عورت مرد کو یکساں سمجھتے ہوئے کبھی عورت کی محبت میں بے غرض دوستی کی فضائے علوی سے محض مجبورِ جذبات عام مردوں کی طرح متنزل ہو کر مذہب کی آڑ میں نہیں آئے۔ آہ اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور اپنی زنانہ دوستوں میں سے کسی کو رفاقتِ دائمی کا شرف بخشتے۔ لیکن باقی عورتیں بلا لنظر بندِ حرم ہوئے۔ اُن سے پیمانِ وفا حاصل کر سکتی تھیں۔ وہ مجھ سے ہمیشہ ایک جرأتِ صدق کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ کیونکہ ہماری محبت میں مخصوص خاوند بیوی کے اظہارِ الفت کے انداز پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ عامیانہ جذبات کا اظہار تو درکنار ہم تو روزانہ ملاقات میں مصافحہ کو بھی غیرِ ضروری سمجھتے تھے اور رسمًا اگر ایسا کیا بھی تو اس میں وہ تپاک وہ گرمجوشی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے سرد ہاتھ سے میرے بدن میں سنسنی پیدا ہو جاتی تھی اور وہ بطریقِ عذر مُسکراتے ہوئے کہا کرتے تھے "میرے تمام بدن کی حدّتِ طبعی میرے دِل نے جذب کر لی ہے"۔ میں کہتی تھی شاید سچ ہو۔

گذشتہ تین سال کے عدیم المثال تعلق میں کبھی خود غرض

انسانی واہمہ نے بھی یہ تجویز نہیں کیا۔ کہ مَیں اُن سے شادی کر کے
بلا شرکتِ غیرے اُنہیں اپنا کر لوں۔ اوّل تو میں زرتشی وہ مسلمان
میں بوڑھی وہ جوان۔ یہ ناجنس پیوند لگ ہی کیسے سکتا تھا دوسرے
جو کچھ میں ان سے چاہتی تھی بغیر بیوی کے "جملہ حقوق محفوظ" کرائے
بھی مجھے برابر مل رہا تھا۔ میں تو اُن سے صرف درسِ اخلاق لیا کرتی
تھی۔ درسِ ناز وہ ایک سے لے کر چار بیویوں تک کو دے سکتے
تھے۔ مجھے اس میں ہوسِ شرکت نہ تھی۔ ان کی شفقت سے روح
و مادہ کی ترکیب میرے جسم میں قائم تھی۔ ان کی مادی پرورش سے
میں مستغنی تھی۔ پس ان کی زندگی میں چار بیویاں اور ہزار زر
خرید کنیزیں اگر اُن سے طلبِ منفعت کی خواستگار ہوتیں۔ تو مجھے
وجہ رقابت نہ تھی۔ اور اب جبکہ وہ فرضِ حیات اور سنتِ مذہب
کے بندھن سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو کر صلۂ تقوے میں ستر
حوروں کے ساتھ جنت میں مصروفِ عشرت ہیں۔ تو بھی میرے
اطمینانِ قلب کے لئے ان کی بے لوث زندگی کی یاد دمِ واپسین تک
تزکیۂ نفس کا موجب ہوتی رہیگی۔ آہ مجھے یقین تھا۔ کہ جب ان کی
بیوی زینتِ حُسن کے لئے اُن سے ستلڑا زریں ہار مانگے گی جس کے
مہیا کرنے میں شاید انہیں درنگ ہو جب وہ بچوں کی مسلمانی پر
اُن سے اسراف بیجا کا تقاضا کرے گی۔ جو اُن سے ممکن نہ ہو گا۔ تو
میں اُن سے فقط اُن کے بیش بہا کتب خانہ کا استعمال چاہوں گی
اور وہ مجھے اپنا علمی پیرو بنانے میں راحت محسوس کریں گے ۔
بیوی ان کی زندگی کی محافظ بن کر شب و روز ان کا احتسابِ اعمال

کر کے دل میں پھولی نہیں سمائے گی۔ لیکن میں ان کی نیکی پر ایمان
رکھتے ہوئے اُن سے کسب فضائل کیا کروں گی۔ لیکن آہ "تھا خواب
میں خیال کو ان سے معاملہ" میری سہ سالہ زندگی کے اوقاتِ معینہ
کی مسلسل و مربوط خواب کو موت کے تخیل شکن وار نے قطع کر دیا۔ آہ
موت کے قانونِ عالمگیر نے مجھ کو بھی اس راحت آفریں خواب سے
اچانک بیدار کر دیا۔ اب میں زندہ ہوں اپنے پرستیدۂ خیال کا
ماتم قائم رکھنے کے لئے۔ میں ان کی زندگی میں ان کی بیوی سے
بڑھ کر اپنے تئیں عشرت نصیب سمجھی تھی۔ ان کی موت نے ان کی
بیوی سے فزوں تر ورثۂ غم بھی مجھے ہی بخشا ہے ۔

آہ ان کے ساتھ ادبی صحبتوں کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی ایک
دفعہ وہ مجھ سے ملے ان کے چہرے سے غیر معمولی انبساط ٹپکتی تھی
مجھ سے کہنے لگے "مدت سے مجھے فیضی کی منظوم بھگوت گیتا کی
تلاش تھی۔ کل اتفاقیہ اس کا ایک نسخہ مجھے ایک مہمان سے میسر آگیا۔
میرا مہمان فقط ایک دن کے لئے میرے ہاں ٹھہرا تھا میں اسے ابھی
رخصت کر کے آرہا ہوں۔ رات بھر کی مہلت قلیل میں میں نے جاگ
کر ساری بھگوت گیتا کی نقل کر لی ہے۔ لیجئے پڑھئے عجیب چیز ہے"⁂
⁂ یہ کہکر اُنھوں نے کاغذوں کا ایک بیڈول سا بنڈل میرے ہاتھ میں دے دیا۔
وہ قلمی نسخہ خط شکستہ میں لکھا ہوا عرصے تک میرے پاس رہا۔ اب
اُنھوں نے دبی زبان سے تقاضا کرنا شروع کیا۔ میں ان کی پریشانی
کا جو انہیں بھگوت گیتا کے ضائع ہونے کے خیال سے پیدا ہو رہی
تھی اندازہ لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ میں انہیں [illegible] رہی اور
اس عرصے میں میں نے ان کے قلمی نسخے کی خوشخط نقل تیار کر لی تھی

ان کے بہت اصرار پر ان کا اصلی نسخہ مع نقل ثانی انہیں یہ کہکر پیش کیا کہ "اصل معہ سود کے حاضر ہے۔ یہ جریدۂ معرفت عالم مفارقت صوری میں عاجزۂ دعاگو کی یاد آوری کا باعث ہو کر رُوح کی تسکین کا موجب ہوگا۔" یہ میرے اور اُن کے تعلقات میں پہلا حادثۂ نیاز تھا وہ کچھ شرمائے کچھ گھبرائے اور اپنی پریشانی کو تبسم مسرت میں چھپا کر رسمی شکریہ ادا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن تصنع کو اُنکی فطرت سے اتنا ہی بُعد تھا جتنا علم ریاضی کو ان کے دماغ سے۔ آخر رُک رُک کر کہنے لگے "سود جب اصل زر سے بڑھ جائے تو فروغ تجارت ماند پڑ جاتا ہے۔ دیکھئے تو آجکل گرانقدر سود دینے والے بنک کس طرح ٹوٹ رہے ہیں۔ فقط طریقِ اعتدال ہی مداومت کا ضامن ہو سکتا ہے"

ایک مرتبہ میں اُنہیں فریب تقریر میں پھنسا کر ان کے نکاح کے متعلق بیوی کا حق انتخاب اُن سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میری یہ بڑی آرزو تھی۔ کہ اُنہیں جلدی ایسی بیوی میسر آئے جو ان کے موجودہ ذوقِ علمی اور روشِ زندگی میں رخنہ انداز ہونے کے بجائے ان کے مجموعی مذاق پر سونے پہ سہاگہ کا کام دے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا طریقِ شادی دیکھ دیکھ کر میں ہراساں ہُوا کرتی تھی۔ کہ مبادا کوئی ایسی اَن دیکھی عورت گلے پڑے جو دنیا ہی میں ان کے لئے دوزخ مہیا کر دے۔ اگرچہ اللہ تعالےٰ نے اُنہیں حُسنِ صوری عطا کرتے ہوئے دریا دلی سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن اپنے مُزکّی و مطاہر وجود میں حُسن سیرت کا وہ بہترین نمونہ تھے گو وہ مسلمان تھے۔ لیکن میں مذہبی کور بصری سے بیگانہ ہو کر اُنہیں

اپنے نکتۂ عرفان میں اپنا اخلاقی پیشوا سمجھا کرتی تھی۔ بلکہ عالمِ وجدان میں اُن کی پاکیزہ زندگی سے متاثر ہو کر اُنہیں ہمیشہ معصوم عن الخطا سمجھتے ہوئے اپنے قلب کے نہاں خانۂ ایمان میں جلوہ گر دیکھتی تھی۔ ان کی عظمت تو میرے دل میں مطاعِ روحانی کے برابر تھی۔ لیکن محبت میں وہ مجھے مُعلّمِ ایمان مُرشد سے بھی بڑھ کر محبوب تھے ہاں وہ مجھے ماں جائے بھائی کی طرح عزیز تھے اور میں اُنہیں اپنا حقیقی بھائی ہی سمجھتی تھی کیونکہ اس سے زیادہ محفوظ اور دلآویز رشتہ اور کونسا ہو سکتا ہے۔ پس قدرتی طور پر میری بڑی خواہش تھی کہ میری بھاوج بھی ایسی جنسِ نایاب ہو کہ عقدِ نکاح سے ہندوستان بھر میں میرے بھائی بھاوج کا جوڑا عدیم المثال نظر آئے میرا بھائی دفترِ ہستی سے مجھے ایک زریں مصرعہ عطا ہوا تھا اور میں مصرعۂ ثانی کی جستجو میں سرگرداں رہا کرتی تھی تاکہ حُسنِ پیوند سے ایسا شعر موزوں ہو کر قدرت بھی اسکی ٹکر کا اسی زمین میں دوسرا شعر پیدا کرنے سے عاجز ہو۔ اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے وہ ہمیشہ شرمایا کرتے تھے لیکن میں جہاں کہیں اچھی لڑکی دیکھ پاتی۔ فوراً اپنے تخیل میں اُسے انکے ساتھ پیوند کر کے سوچا کرتی کہ فلاں لڑکی کے ساتھ ان کی زندگی کیسے کٹے گی۔ چنانچہ وہ میری ریشہ دوانیوں سے تنگ آ گئے تھے ایک دن کہنے لگے "سنئے حُسن و عصمت و موسیقی کے مجموعہ کو میں شعرِ حیات سمجھتا ہوں ان تینوں صفات کے یکجا جمع ہو جانے سے جو مرکب حاصل ہوتا ہے۔ وہ حقیقی اور قدرتی شعر ہے اسی روح پرور مرکب کو بے ذوق لوگ عورت سے موسوم کرتے ہیں یا یوں کہو کہ عورت اور شعر عشق کے لئے داروئے شفا اور زندگی کے لئے روحِ بقا ہیں لیکن ہندوستان کی دائم الحبس

عورت جوہر شناس مرد کی نگاہ سے محفوظ رکھی جاتی ہے آہ وہ ایک ایسا پھول
ہے جس پر حُسن پاش آفتاب کی نگاہ کبھی نہیں پڑتی جو بالیدگیٔ صحیح کا باعث ہو
اسلئے اُسے نہ تو صنفی نشو نصیب ہوتا ہے نہ اس پر جنسی رنگ چڑھتا ہے
اس سے نہ مشامِ روح پرور پیدا ہوتی ہے یا یوں کہو کہ وہ ایک شعر ہے۔
جسمیں قافیہ کا اہتمام تو کیا گیا ہے لیکن نہ اس میں خیال ہے نہ نُدرت نہ
کسی اُستاد کی اِصلاح سے بندشِ الفاظ میں چستی آپ ہی بتائیں۔ ایسا
مُرجھایا ہوا پھول یا ایسا صنعتِ سکتہ رکھنے والا شعر کب مرغوبِ خاطر ہو سکتا
ہے۔ لیکن آخر جو مادۂ ستائش خداوند قادر و توانا نے تمام روئے زمین
کے مردوں کی طرح ہندوستان کے نامُراد مردوں کو بھی ودیعت کیا ہے۔
وہ دائم ایک ایسے وجود کی تلاش میں رہتا ہے جس کے لئے تڑپنے لڑنے
وقفِ تمنا ہوجائے۔ یعنی کامل طور پر اس میں جذب ہو کر امتیازِ شخصیت
کو کھو دے۔ آپ ہی بتائیں یہ بات ہندوستان میں کیسے میسر ہو سکتی ہے
پھر بتائیے ہیں اس رسمی جنجال میں کیوں پھنسوں۔ مرد دوست تو محبت
جیسی متاعِ گرانقدر کے قطعی نا اہل ہیں۔ اوّل تو ہر دوست اپنے اپنے
آلامِ عاشقانہ میں گھِرا ہوتا ہے اسکی توجہ عرضِ حال سے تو ہو نہیں سکتی
اور اگر ہو بھی تو اس تعلق میں وہ حدت نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں وہ
تصرفِ بلاشرکت نہیں۔ عورت کیساتھ کامیاب عشق کا نتیجہ ہے پیمانِ
وفا یعنی عقدِ نکاح۔ دوست کے ساتھ انتہائے عشق کبھی رفاقتِ دائمی
کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ مضبوط سے مضبوط دوستی بھی وجہ معاش پر قربان
ہو جاتی ہے اور پھر ریلوے جنکشن کے اتفاقی ملاقات کے سوائے تجدیدِ
اُلفت کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہتا اور اگر اتفاقِ ملازمت زابلستان میں ہو

تو سمجھو جیتے جی دوست ایک دوسرے کے لئے مر جاتے ہیں اور میں تو کہتا ہوں آسان ترین مرگِ دوستی ایک دوست کی شادی پر ہی واقع ہو جاتی ہے۔" مجھے اس کے بعد پھر کبھی اس مسئلہ پر گفتگو چھیڑنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ان کی زندگی میں سامانِ عیش کو قطعی دخل نہ تھا۔ ان کے لباس اور دسترخوان میں طالب علمانہ زندگی کی مبالغہ آمیز جھلک نظر آتی تھی۔ زرق برق پوشاکوں سے انہیں نفرت تھی۔ سبز نبات اور آبِ مقطر پر مدارِ حیات تھا۔ غالباً اسی وجہ سے انکی صحت بہت درست رہتی تھی اور سوائے ذہنی بیماریوں کے انہیں اور کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہ ہوتا تھا انکے دوست انہیں چھیڑنے کے لئے کبھی کبھی شلیگل کے کارخانے کی سوئیٹس نعمت اللہ کی دوکان کی شیر تختیت ثقیل مٹھائیاں پشاوری باسترمے (خشک کباب) نیلپیر کی ماہیِ دم پخت پیش کیا کرتے تھے۔ تو وہ اُن کے شتر غمزوں سے جھلا کر بھری محفل چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ تازہ دودھ کا استعمال وہ مقدار قلیل میں بطور دوا کیا کرتے تھے لیکن کوئی شربت جس میں اجزائے شیر ملے ہوں وہ نہیں پی سکتے تھے۔ ایک دفعہ میں ان کی ضد توڑنے کے لئے سوڈے میں بجھا ہوا دودھ پلانے پر مصر ہوئی تو بیچارے کی جان پر بن گئی۔ مجھے بھی نہ معلوم اس روز کس شیطانی وسوسے نے گھیر رکھا تھا۔ وہ اپنے انکار کی ظاہرا کج خُلقی کو خندۂ نیاز میں چھپاتے ہوئے تبسم کناں مکان کے تمام کمروں میں دوڑتے پھرتے تھے اور نگاہِ مسترحم سے مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھتے جاتے تھے۔ آخر میں نے جست کر کے ان کا دامن پکڑ لیا اور اب وہ صدقۂ التفات کے لئے مجبور ہو کر کوچ پر گر پڑے۔ انکی اس افتادِ محبت سے صدائے الحاح

پیدا ہوکر میرے دل میں بیٹھ گئی۔ لیکن میں اپنی ضد پر قائم تھی۔ گلاس پیش کرتے ہوئے کہا "لو یہ زہر ہے زہر۔ میری خاطر پیو گے نا" وہ مُسکرائے اور میرے ہاتھ سے گلاس چھین کر آنکھیں بند کرکے دافع بلادوا کی طرح ایک سانس میں پی گئے۔ میں اپنی اس فتح پر شرمندہ ہوکر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ شام تک "معرکۂ مذہب و سائنس" پڑھتے رہے اور مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ آخر شب بخیر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

اگرچہ وہ خلقی حیا اور حجاب کے باعث محبّت افروز گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن مجھے ان کے ظاہری برتاؤ سے کبھی کبھی شبہ سا ہوا کرتا تھا کہ اُنہیں مجھ سے غیر معمولی تعلق ہے۔ حقیقی دوستی کے مقابل ہیجانِ عشق کو وہ حقیر سمجھتے تھے۔ اُنہیں مکتبی لڑکیوں کے ساتھ مجنونانہ عشق سے سخت نفرت تھی۔ کیونکہ ایسے تعلق کے پُرثبات ہونے میں اُنہیں شبہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں تو ان کی روزمرہ کی معمولی حرکات و سکنات اور مُبہم سے فقروں سے اپنے متعلق ان کی شفقتِ خصوصی کا پتہ لگا لیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اور میں سیر کرتے کرتے دریا کے آہنی پل پر پہنچ گئے۔ کثرت برسات سے دریا متلاطم تھا۔ لہریں اُبھر اُبھر کر چک پھیری کھاتی ہوئی وسعتِ آب میں معدوم ہو جاتی تھیں۔ چاند لکۂ ابر میں آیا ہوا آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ گویا کہ اس کا تابناک چہرہ حسینہ کے آنچل میں نصف پنہاں نصف درخشاں حُسنِ قدرت کی یکرنگی پر شاہد تھا۔ وہ گہرے تخیل میں ڈوبے ہوئے پل کے فولادی جنگلہ پر میرے شانہ کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ مینے کہا "اگر ایک بڑا سا پتھر وسطِ دریا میں وسعتِ آب سے باہر نکلا ہو تو ہم اسوقت تمام

دُنیا سے قطع تعلق کر کے اس پر بیٹھ کے رقاصۂ آب کا تماشہ کریں۔"
اُنھوں نے نظریں تو لہروں پر گاڑے رکھیں اور بولے "تو پھر میرا دل نکال کر دریا میں پھینک دو۔"

مَیں نے فوراً باتقائے شیطانی کہا "سختی میں تو واقعی آپکا دل بھی پتھر سے کم نہ ہوگا لیکن اس میں میرے بٹھانے کیلئے وسعت کہاں سے لاؤ گے؟"
بات کرنے کو تو ہم دو نوکر گئے۔ مگر فوراً ہی شرم وحجاب کے اثر نے ہمارے لبوں پر خاموشی کی مُہر لگادی۔ اور ہم اس سکوتِ سنگیں میں ڈوبے ہوئے تمام سیر میں پھر ایک دوسرے سے مخاطب نہ ہو سکے۔

مَیں ان کی زندگی میں تو بین القلوب تعلق پر کبھی لب کُشا نہیں ہوئی لیکن اب جبکہ وہ خلد آشیاں ہو چکے ہیں۔ تو ان کے ذکر سے تسکین حاصل کیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ یہ سطریں لکھتے ہوئے شرم کے مارے میرا قلم رُکتا ہے لیکن جب لکھنے لگی ہوں۔ تو بالکل صحیح صحیح لکھوں گی اور جب وہ ہی نہ رہے تو پھر کس کا حجاب اور کیسی شرم۔ ہاں۔ مجھے یقین ہے انہیں مجھ سے محبّت تھی۔ مگر وہ عامیانہ طریق اظہار سے بیزار تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ صحیح جذبات کے ہوتے اظہارِ بیتابی سے صداقت میں شبہ پیدا ہوتا ہے۔ محبّت کا یقین اقرارِ محبّت سے کم ظرف لوگ کرایا کرتے ہیں۔ ان کے فارغ التحصیل ہونے کی خوشخبری مجھے احمد آباد ملی۔ میں اس موقعہ پر کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں مناسب تریں تحفۂ نیاز گذارنا چاہتی تھی۔ یعنی کوئی ایسی چیز جو کثرتِ استعمال کے باعث ہمیشہ ان کے ہاتھوں میں رہے۔ مجھے خوف تھا کہ انگوٹھی لینے سے وہ انکار کر دینگے کیونکہ مردانہ غیرت کو نسائی زیور سے مجروح کرنا وہ کبھی گوارا نہ کرتے۔

دوسرے انہیں انگوٹھی پہنانے کا حق تو میں فقط انکی خوش بخت بیوی کیلئے مخصوص سمجھتی تھی۔ میں اپنی نئی بیاہی سہیلیوں سے فلسفۂ تحایف پر بسیط خطبات سن چکی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کر ہی لیا احمد آباد سے چلتے ہوئے میں ان کیلئے ایک چائے کا سٹ لیتی گئی جس میں پیالیاں شامل نہ تھیں۔ کیونکہ پیالیاں بہر حال ہیں چینی کی ہونی چاہئیں۔ جو احمد آباد سے دستیاب نہ ہو سکیں۔ میرا خیال تھا کہ جس وقت ان کی بیوی انہیں سامنے بٹھا کر چائے پلایا کرے گی اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوا کریگی۔ تو میں بھی سحر جذبات کے طفیل اپنی ماہیت جسدی سے بیگانہ ہو کر اس ٹی سٹ کے ذریعہ آتشِ سیال بن کر ان کی رگ وپے میں نفوذ کر جایا کرونگی۔

بڑی ہمت کر کے میں نے رکتے رکتے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا ادھورا تحفۂ عقیدت پیش کیا۔ گھبراہٹ سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی اور میں ایک حرف بھی ترسیلِ ہدیہ میں زبان سے نہ نکال سکی۔ ادھر وہ رسنگ مرمر میں تراشے ہوئے اپالو کی طرح جو نظر چڑھانے والی دوشیزہ کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے اور تمام عجز و نیاز کے جواب میں سکوتِ سنگین کو ابروئے چشم کے خفیف سے اشارے سے بھی نہیں توڑ سکتا میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے بوجھ ہٹانے کے لئے اپنے ہاتھ کو جنبش تک نہ دے سکے۔ آخر میں نے تھک کر سٹ ان کے سامنے میز پر رکھدیا۔ یہ جانگداز ڈراما تیس سیکنڈ میں ختم ہو گیا لیکن وہ تیس سیکنڈ کا تجربہ ایسا ہی تھا جیسا مرتے وقت شاہ رگ کے تنگ رستہ سے روح کے سفر آخری میں ہر شخص کو پیش آتا ہے۔ ان کا رنگ انار کی طرح آتشیں ہو گیا اور اب میری نگاہ ان کے چہرے کی سرخی کی حریف نہ تھی

میں نے آنکھیں نیچی کرلیں اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور بغیر نگاہ ملائے عرض کیا "چلیئے۔ چینی کے ظروف سے اس ادھورے سٹ کو مکمل کریں۔ میرے ساتھ چل کر آپ خود پیالیاں منتخب فرمالیں"۔

اب وہ اپنے قلبی درد پر قابو پا کر مُسکرائے اور کہنے لگے "جو کچھ پیش نظر ہے کیا یہ کافی نہیں"۔

عرض کی "اگر آپ کو ناگوار ہے تو نہ سہی لیکن اگر آپ اسی حد تک سُرخ چہرہ بنانے پر اکتفا کریں تو میں ضرور پیالیاں بھی پیش کرنے کی جسارت کرونگی"۔

اب وہ بناوٹی قہقہہ مار کر ہنسے لیکن آواز کی لچک سے عیاں تھا کہ وہ محض مجھے خوش کرنے کو ہنس رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں اس وقت وہ انبساطِ طبعی سے کوسوں دُور تھے۔

کہنے لگے "نہیں آپ ہرگز نہیں لائیں گی"۔

میں انہیں ذرا بشاش پا کر زیادہ شوخ ہوتی گئی۔ جواب دیا "میں تو ضرور لاؤں گی"۔

اب وہ ایک محبّت بھرے انداز میں میری طرف بڑھے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا میری کمزور طبیعت کو اپنے قوی ارادہ سے مسحور کر رہے تھے۔ بڑے وثوق سے مُسکراتے ہوئے فرمانے لگے "نہیں مجھے یقین ہے آپ ہرگز نہیں لائیں گی"۔ اور یہ کہکر اُنہوں نے مجھے شانہ پر خفیف سا جھٹکا دے کر بٹھانا چاہا۔ میں وہ ہلکا سا جھٹکا کھاتے ہی شرارتاً لڑکھڑاتی ہوئی دور تک چلی گئی اور ایک سوفے پر دھم سے گر پڑی اور مایوسی کے لہجہ میں عرض کی کہ "میں آپ کے تشخصی اعتماد کو جھٹلانا نہیں چاہتی۔ اچھا نہ سہی"۔ حقیقت میں میں انکی خلاف مرضی مناسب بات کرنیکا حوصلہ

بھی اپنے میں نہ پاتی تھی۔ چنانچہ میرا ہدیہ نیاز اندیشہ ناقبولی کے سبب ادھورا ہی رہا اور مجھے مکرر جسارتِ تہدیہ نہ ہو سکی۔

عامیانہ مشاغل سے انہیں بہت نفور ہوا کرتا تھا۔ ہندوستانی ڈرامے سے وہ بہت بیزار تھے کیونکہ سٹیج کی مصنوعات کو روزمرہ کی زندگی سے بالکل مختلف پاتے تھے۔ ایکٹنگ میں عاشق و معشوق کی پُر تصنع منظوم گفتگو انہیں بہت ناپسند تھی ۔ البتہ سینما (متحرک تصاویر) دیکھنے کے وہ بہت شائق تھے وہاں وہ یورپ کے صحیح تمدن کا مطالعہ کیا کرتے تھے اسی طرح انہیں دیگر لہو و لعب کی مجالس سے بہت نفرت تھی۔ وہ اپنی بیدار زندگی فلسفہ و ادب کے مطالعہ میں گذارتے تھے فضول گپ سے وہ ہمیشہ بھاگتے تھے۔ شام کی دو تین گھنٹے کی چہل قدمی میں وہ کبھی ناغہ نہ پڑنے دیتے تھے۔ یہی ان کی سیر و تفریح و ورزش ہوا کرتی تھی۔ اس لمبی سیر میں مَیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی اور مجھے ان کے کیرکٹر کے مطالعہ کا خوب موقعہ ملتا تھا وہ مجھ سے مل کر مختلف مسائل پر بحث کیا کرتے تھے لیکن اس عرصہ میں مَیں نے کبھی انکے منہ سے درشت کلامی یا غیبت نہیں سُنی۔ گالی سے تو یقیناً جب سے وہ پیدا ہوئے تھے ان کی زبان کبھی ملوث نہ ہوئی تھی! ان کی پاکیزہ باتیں تمام سوسائٹی کے اصلاح اخلاق کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے مواعظِ حسنہ میں کبھی خود ستائی یا تفاخر کی بو نہ ہوتی تھی۔ بعض متکبر لوگ عیب چینی کے رنگ میں ہمیشہ دوستوں کے نقص نکال کر اپنی نیکی و عظمت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے وہ نہایت دردمندانہ انداز میں اشارتاً مسکراتے ہوئے (تنبیہ کا اثر کم کرنے کے لئے) دوست کو اسکی غلطی سے مطلع کر

دیا کرتے تھے۔ البتہ ذاتیات پر نہ وہ خود گفتگو کرتے تھے۔ نہ سُن سکتے تھے
لیکن مجھے تو ہر صحبت میں وہی باتیں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ جن میں کسی
نہ کسی پہلو سے ان کی نج کی زندگی اور اخلاق پر روشنی پڑے۔ میں ہمیشہ
ان کے سوانح حیات ان کی زبان سے سُن کر خوش ہوا کرتی تھی۔ بلکہ انکے
خاندانی معاملات اور مخفی افکار و اذکار جن کا تعلق کسی عنوان سے اُنکے
یا اُنکے عزیز و اقربا کے ساتھ ہو ان سے کُرید کُرید کر پوچھا کرتی تھی۔ یہانتک
کہ وہ میری موشگافی سے تنگ آجاتے تھے۔ اگرچہ وہ عربی اور میں عجمی
تھی۔ مگر میرے دل میں ہمیشہ شرکتِ نسلی کا ثبوت بہم پہنچانے کا جنون رہتا
تھا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب کہ میں نے ان کے اور اپنے
نسب ناموں کے مقابلہ پر باوجودِ اختلاف مذہب و مولد کے ان کا اور
اپنا مورث اعلےٰ حضرتِ عدنان ہی کو پایا۔ اگرچہ نسبت دور کی تھی۔
مگر یہ خوشی کیا کم تھی کہ ان کی اور میری رگوں میں ایک ہی خون موجزن تھا میں
فرطِ محبت کے باعث ہمیشہ ان کی بیزاری کے سامان مہیا کر دیا کرتی تھی۔
کیونکہ میرے مخصوص مبحث بوجہ ذاتی رنگ رکھنے کے ان کے لئے رنجدہ ہوگئے
تھے۔ میں ہمیشہ ان کے مذہب ان کے اخلاق انکے کیرکٹر انکے خاندان اور
انکے احباب کے متعلق سوالوں کی بوچھاڑ کرتی رہا کرتی تھی۔ اُنکے اعلےٰ اخلاق
کی ستائش یا ان کی ذات سے بھی گذر کر ان کے معروف خانوادہ کے ساتھ
اپنی عقیدت کا اظہار سچے دل سے کرتی رہتی تھی یہی انہیں بہت ناگوار تھا
یہ تو کچھ اربابِ وفا ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مجھے شخصی گفتگو میں کیا راحت ملتی تھی
مگر ان کے حجابِ فطری کو مسلسل شخصی [illegible] گفتگو [illegible] کی تاب نہ تھی۔ ایک
دن جھلا کر بولے "کیا دین و دنیا کا اور کوئی ذکر نہیں سوجھتا۔ آپ تو فقط

حکائے من و تو ہیں منہمک ہیں اور ہیں دونوں سے بیزار"

مذاہبِ عالم کی اصلِ غایت سے وہ واقف ہو چکے تھے۔ اسلئے انکی کوشش بھی یہی ہوتی تھی۔ کہ کسی کو ان کے ہاتھ یا زبان سے ایذا نہ پہنچے اور اسے ہی وہ بہترین عبادت سمجھتے تھے۔ مذہب کے متعلق وہ اپنے خیالات مجھ سے بھی محفوظ رکھا کرتے تھے۔ لیکن میں جیسے انکی زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل ہو چکی تھی۔ ان کے مذہبی تخیل میں بھی دراندازہونیکے لئے بیقرار رہا کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک خط لکھ کر دریافت کیا کہ "مجھے کھولکر بتائیں تو سہی آپکا مذہب کیا ہے۔ آپکو ظاہری رسومات کی پابندی سے اس قدر تغافل کیوں ہے۔ حالانکہ اگر اور کچھ نہ ہو تو کم از کم مذہبی رسومات کی پابندی سے اصلاحِ اخلاق اور تربیتِ اعمال ہی ہوتی رہتی ہے" لیکن وہ میری چالاکی کو سمجھ گئے اور گول مول جواب دیکر مجھے ٹال گئے۔ انہوں نے بڑی سخت چوٹ تو میرے مذہبی وجدان پر یہ کی کہ "مذہب ہر شخص کا ذاتی نہاں جذبہ ہوا کرتا ہے۔ اس میں دوسرے شخص سے موافقت کی توقع رکھنا فضول ہے۔" پھر فرمانے لگے "جب مذہبی رسوم کی پابندی کثرت ریاضت سے فطرتِ ثانیہ بن جائے تو بجائے روحانیت پیدا کرنے کے محض ورزشِ جسمانی کا بدنما سا چربہ رہ جاتی ہے پس غیر ارادی فعل ہو کر بے اثر ہو جاتی ہے۔ بھلا ایسی پابندی سے اصلاحِ اخلاق کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ جو لوگ زیادہ قیودِ رسوم میں گرفتار ہوں۔ انکا دماغ فلسفۂ عبادت پر غور کرنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ عبادات میں مبالغہ کرتے ہوئے عبادت کو بجائے منزلِ مقصود پر پہنچنے کا ذریعہ بنانے کے مذہب کا اصل مقصد سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ ریاضت کش لوگ کوتاہ بین متعصب اور خود پسند

ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں محض رسوم کی سخت پابندی نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور وہ سنجیدہ تر فرائض انسانی سے اپنے تئیں سبکدوش سمجھ کر تربیتِ اعمال سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں اور ایسی اندھی ریاضت بجائے اخلاق سنوارنے کے مخربِ اخلاق ثابت ہوتی ہے۔"

میں نے مکرر انہیں خط میں لکھا کہ آپ کا مذہب اسلام تو یزداں شناسی کے فن کو بھی ارتقائی ثابت کرتا ہے اور سلسلہ مذاہب میں آخری ہونیکے باعث اصولِ ارتقا کے بموجب مذاہب عالم میں مکمل شریعت کے حامل ہونے کا دعویدار ہے۔ پھر آپ کیوں نہیں اسلامی محدثین و مفسرین سے درسِ مذہب حاصل کرتے۔ انہوں نے جل کر جواب دیا۔ "میں تو حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کو حاملِ صداقت سمجھتا ہوں اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے ارتقائی منزل پر قرآن شریف کو شاہد قرار دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمام تجدید کو تخریب۔ تازہ انکشافات کو بدعات۔ روایات کو حکایۂ عقیدت۔ کرامات کو فسانہائے رنگیں۔ اجتہاد کو ضلالت اور تقلید کو موت سمجھتا ہوں۔"

آہ موت کو سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھنے والا بھی اسکے حیات سوز حربہ سے نہ بچ سکا اور وہ روح جو تنگئ جسد سے گھبرا کر ہمیشہ رفعت کیلئے بیقرار رہا کرتی تھی۔ آخر ملاء اعلےٰ کی بے پایاں وسعت میں سما کر نامحدود میں جذب ہوگئی۔ ان کا یہ قول تھا کہ جب تک بدن میں روح باقی ہے انسان کو بدعملی سے توبہ۔ نیکی کرنے کا مقدور اور نوعِ انسانی کے معیارِ تہذیب کو بلند کرتے رہنے کا موقعہ ہے۔ موت کا تصور قوا میں انحطاط اور مزاج میں سستی پیدا کرتا ہے پس ہمیشہ بلند نصب العین قائم کرکے حصولِ مراد میں کوشاں رہنا چاہئے اور ہر کامیابی کے بعد بجائے تساہل نشاط کے بلندتر

نصب السّاعی پیدا کرکے وقفِ مدعا ہوجانا چاہیئے۔ خود غرضانہ زہدیات وضت
کے صلہ میں کسل آفریں بہشت کا بیعنامہ حاصل کرنے کی آرزو فطری
کمزوری کے باعث پیدا ہؤا کرتی ہے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ سے خالص عبودیت
کا تعلق جو صدقِ نیاز سے مستحکم ہوتا ہے۔ ایسے سوداگری کے جذبہ سے
قطعی تہس نہس ہوجاتا ہے عشق اور بوالہوسی میں خواہ حقیقی ہو یا مجازی مابہ الامتیاز
ایثارِ مطلق ہی ہؤا کرتا ہے وہ کہا کرتے تھے" قربانی کرو محض قربانی کرنے کے
شوق میں ورنہ جو خیرات وایثار سود وزیان کو نگاہ میں رکھ کر کیا جائے۔
سقوط تقوےٰ کا موجب ہوتا ہے"۔ اربابِ محنت کی جنت وہ اس وجدانی
کیفیت کو سمجھتے تھے۔ جس کی آفرینش روحانیت میں اور نشو حیات عرقِ سعی
سے ہؤا ہو۔ دیکھ لو انسانی زندگی میں باوجودیکہ قوائے جسمانی مضمحل ہوتے
جاتے ہیں افکار روحانی برابر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ پس آخر کار جب انحطاطِ
جسمانی کے ماتحت جسدِ انسانی تمام تر خاکستر ہوجائے تو آزاد شدہ روح
میں پھر بھی احساسِ نوعیت کے ساتھ جوہر ترقی قائم رہیگا اور اب سفلی
آلائشوں سے بالکل پاک ہوکر یزدانی عرفان میں غیر منتہی کمال پیدا ہوتا
رہیگا ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وہ روح جو بطلانِ تناسخ میں کہا جاتا ہے
کہ بقائے دوام کے دوران میں فقط ایک بار ایک خاکی پتلے میں قید ہوکر
بلالحاظ اس شخص کے خاکی نشوِ کمال یا انحطاطِ زوال کے برابر ترقی کر
سکتی ہے۔ تو شخصیتِ مادی کے قطعی نابود ہوجانے پر کیونکر عملِ جاریہ
کے ناقابل ہوجائے گی یعنی جو روح کہ بدن کے اضمحالِ پیہم (جس کی آخری
صورت مرگِ جسدی میں بدل جاتی ہے) کے دوران میں برابر ترقی کرتی رہتی
ہے وہ اسی زوال پیوستہ کے آخری اور لابدی نتیجۂ موت پر بھی اپنے عملِ

فطرہی سے باز نہیں رہ سکتی۔پس روحانی ترقی کے غیر منقطع سلسلہ میں تو پیکرِ جسمانی کا عدم وجود برابر ہے۔پھر یہ توقع رکھنی کہ خدائے عادل روح کی نامحدود زندگی کے دوران میں ساٹھ یا ستر سال کی ساعت موہومہ کی قیدِ جسدی کے زمانہ کے نیک و بداعمال کے صلہ میں ابدالآباد تک کے لئے روح کو بہشت یا دوزخ میں دھکیل دیگا۔رب العزت کی صفت عدل کی مضحکہ خیز تفسیر ہے۔"

ایک دفعہ میں نے آلامِ حیات سے تنگ آکر خودکشی کو علاجِ ناکامی سمجھتے ہوئے ان کے سامنے اس فعل کے بزدلانہ پہلو پر مخالفت کے انداز میں بحث کی تو وہ فرمانے لگے۔"کیا آپکا خیال ہے کہ آلامِ انسانی کا خاتمہ خود آوردہ موت سے ہوسکتا ہے۔بلکہ جو لوگ محنت سے جی چرا کر فرائض انسانی کو دیانت سے بجا نہیں لا سکتے۔وہ حادثہ موت سے محض تبدیل منظر کے ساتھ اپنے تئیں پھر ایک تازہ روحانی جدوجہد میں پائیں گے اور بوجہ سستی کے جس قدر وہ پیکارِ حیات میں پیچھے رہ گئے تھے۔اسی قدر نقصان کیساتھ انہیں فضائے روحانی میں پرانی جدوجہد جاری رکھنی پڑے گی۔البتہ دنیا کی فرائض ناشناسی کی زندگی کے وبال میں وہ اپنے نئے آماجگاہ میں بھی اپنے تئیں اپنے ہم سفروں کے درمیان درماندہ و ناکارہ پائیں گے۔خودکشی محض اسی حالت میں فیصلہ کن ہوسکتی ہے اگر بدن کے نیست ہونیکے بعد روحانی جدوجہد کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہو ورنہ دنیا میں ہمیں جس قدر زیادہ عمر ملے اور جس قدر ہم میں فرائض شناسی کا نیادہ مادہ ہو ہم اسی قدر روح کو جہادِ روحانی کے واسطے بہتر اسلوب پر تیار کر سکتے ہیں پس عمرِ طبعی کو ابدالآباد کی روحانی زندگی کے لئے مہلتِ تربیت

سمجھ کر درازئِ عمر کو غنیمت جانتے ہوئے اس وقفۂ درسی میں کسبِ فضایل میں مبالغہ کرنا چاہئے"

میں نے عرض کی کہ "اس منزلِ آخری پر پہنچنے کی آرزو تو آپکو بھی بیقرار رکھتی ہوگی۔ کیا آپکو اس ہولناک مسافت کو جلدی قطع کرنے کے خیال سے بھی خودکشی کی آرزو پیدا نہیں ہوئی" اب وہ مسکرائے اور میں سمجھ گئی۔ کہ فلسفی دماغ پر شعریت کا اثر غالب ہو چلا ہے۔ کیونکہ اُن کے چہرے پر رقصِ ترنم ہمیشہ نغمۂ خیال کی شرکت سے ہوا کرتا تھا۔ وہ بولے "ہاں ایک مرتبہ مجھے اس قدر ذہنی عشرت نصیب ہوئی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس حادثۂ نشاط کے گذر جانے کے بعد پھر قدرت بھی مجھے ایسی انبساط بخشنے سے قاصر ہوگی۔ اس وقت میں چاہتا تھا۔ کہ مجھ پر ایک ایسی مدہوشی طاری ہو جائے کہ میں اس آخری احساسِ سرور کو لئے ہوئے فنا ہو جاؤں"

آہ! اُن کے شاعرانہ مذاق میں بھی رمزِ حقیقت ہوا کرتی تھی۔ اب جبکہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ میں ان کے سوانح حیات بہم پہنچا دل کو تسلی دینا چاہتی ہوں تو دل اور گرنے لگتا ہے۔ اُف محبت کا محشر خیز جذبہ بھی موت پر فتح نہیں پا سکتا۔ ان سے شناسائی کی قلیل مدت میری زندگی کا بہترین انبساط افروز حصہ تھا۔ کاش ان کے جیتے جی میں اس "احساس سرور میں فنا ہو جاتی" کیونکہ اس مادیت کے دور میں تو قدرت بھی مکرر ویسی مزکی ہستی پیدا کرنے سے عاجز معلوم ہوتی ہے۔

میں ان سے اکثر غرورِ اُلفت میں عہد و پیمان لیتے ہوئے اپنی موت کے بعد خراجِ اندوہ حاملِ جذبات منقوش سنگِ مزار کی شکل میں چاہا کرتی تھی۔ آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے ہی ان کے لوحِ مزار کو اشکِ عقیدت

سے دھونے کے لئے زندہ رہنا ہوگا۔ آہ اگرچہ تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہو۔ لیکن میری روح تمہاری روح سے عہدِ راسخ کرتی ہے کہ جب تک اُسے بھی قیدِ حیات سے رُستگاری نہیں ہوتی وہ تمہاری برسی کو قائم رکھے گی۔ ہاں اگرچہ تمہارا مزار ریل کے اتصال سے بہت دُور بنایا گیا ہے۔ جہاں اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بجائے ریل بچھانے کے اس جادۂ آہنی کو سُرعت کے ساتھ اُکھاڑا جا رہا ہے۔ لیکن میں پھر بھی ریگ و دریا کی لہروں کا مقابلہ کر کے تمہارے احباب کو وہاں اکٹھا کیا کروں گی جب میں وہاں سوزِ اشک کے ساتھ تمہاری منقبت کے گیت گایا کروں گی۔ تو فرشتے آسمان سے اُتر کر تمہارے مزار پر آنسو بہایا کرینگے۔ لیکن مجھے افسوس ہے۔ تو یہ کہ تمہارے سوگوار اقربا کو تو لوگ دل ریش تعزیت سے تنگ کر ڈالتے ہیں۔ لیکن تمہاری بے زبان سوگوار کتابوں اور تمہاری بے مونس کنیز شمسہ کو کوئی پرسا دینے والا بھی نہیں۔ آہ۔ کہا جاتا ہے کہ ہم مشرب لوگ عاقبت میں بلحاظ شرکتِ اعمال ایک مقام میں رکھے جائیں گے۔ کاش تمہاری یاد میں جذب ہو کر میرے افکارِ روحانی بھی مجھے تمہاری تصویر بنا دیں۔ تاکہ اس مفارقتِ صوری کے بعد میری روح زندانِ خاکی سے آزاد ہو کر تمہاری رُوح میں سما جائے۔

پرستارِ خیال شمسہ آذری

تمام شد

جدید کتب
قیمت
گوڈر کالال (حصّہ اوّل و دوم) مصنفہ والد سید افضل علی (ایم - اے) ہے/
گوڈر کالال (حصّہ سوم) مصنفہ // // // ۸/
سعادت کا سہرا - - // // // // ۳/
شعلۂ نہاں - - - // // // // ۴/
المشـــــــــتاھر
سید افضل علی ایم اے دفتر انڈین کمیشنر لاہور